آدمی کی بستی میں
عزیر انجم

آدمی کی بستی میں

عزیر انجم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Aadmi Ki Basti Mein

(A Collection of Stories)

by: *Ozair Anjum*
Banjaria, Motihar
East Champaran-845401(Bihar)

Year of Ist Edition 2009
ISBN 978-81-8223-493-2
Price Rs. 100/-

نام کتاب	:	آدمی کی بستی میں
مصنف	:	عزیر انجم
پتہ	:	انجم منزل، بنجریا موتی ہاری، مشرقی چمپارن (بہار) 845401
		فون: 260866 (06252)، موبائل: 9430075008
سن اشاعت اول	:	۲۰۰۹ء
قیمت	:	۱۰۰ روپے
تعداد	:	۳۰۰
کمپوزنگ	:	محمد اکرام
سرورق	:	مصطفیٰ کمال پاشا
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

:- ملنے کے پتے :-

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی 110025 ☆ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ

☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ☆ کتاب منزل و کتاب مرکز، موتی ہاری، مشرقی چمپارن

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
ahoo.comE-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@y
website: www.ephbooks.com

انتساب

والد محمد سجاد حسین (مرحوم)

اور

والدہ رقیہ خاتون

کے

نام

فہرست

ہدیۂ تشکر

6

میں یہاں کچھ ایسے کرم فرماؤں، احباب اور ہم نواؤں کو یاد کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میرے ادبی سفر کو جاری رکھنے کے لیے مجھے ہمیشہ آمادہ رکھا۔

مجھے معلوم ہے کہ نہ الفاظ مرتے ہیں اور نہ یادیں۔ یہ جو ایک بہانہ ہاتھ آیا کہ کہانیوں کی کتاب شائع کروں، میں نے سوچا کہ کیوں نہ الفاظ اور یادوں کو ہم سفری کا موقع دے دیا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ دونوں کب تک اور کہاں تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ احباب میرے باطن کو روشن کرنے کا بہانہ رہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں دوستوں سے ہی جینے کی آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں بلکہ جوان رہتی ہیں۔ میں اپنے تمام ایسے دوستوں کا، ان کی تمام تر احتسابی و اختلافی محبتوں اور تلخیوں کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ میری معمولی سی کاوش کو سراہتے نہیں تو شاید یہ معاشرتی اور انسانی نفسیات کی کہانیاں معرضِ وجود میں آکر منصۂ شہود پر نہیں آتیں۔ کوثر مظہری کے اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں:

آپ کو شاید یہ اندازہ نہ ہو مجھ کو تو ہے
کس قدر راحت ملی ہے حلقۂ احباب سے

پروفیسر محمد انوارالحق، فاروق راھب، تفضیل احمد، ظفر مجیبی، ڈاکٹر اختر صدیق، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر حاتم جاوید، امتیاز احمد (صحافی)، سنجے کوشک (صحافی)، شیخ عقیل احمد، نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر مولا بخش، کوثرمظھری، مشتاق صدف، ظفر حبیبی، سبطین کوثر، محمد علیم، عقیل مشتاق، ضیا ربانی، شکیل شاغل، ذاکر حسین ذاکر، فیصل رحمن، عظیم اقبال

''آدمی کی بستی میں'' پر دو باتیں

فاروق راھب

اردو کے جواں سال افسانہ نگار، شاعر اور صحافی عزیر انجم کے افسانوں کے پہلے مجموعہ کا مسودہ ''آدمی کی بستی'' میرے سامنے ہے۔ عزیر انجم کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کا مرقع ہے، بے غرض اور صاف گو انسان ہیں اور انہوں نے بڑی صاف گوئی سے اپنا یہ مسودہ پریس میں جانے سے پہلے اس پر کچھ لکھنے کے لیے میرے حوالے کردیا جب کہ میں مبصر یا ناقد نہیں ہوں۔ یقیناً یہ میرے لیے مشکل مرحلہ ہے۔ میں آج بھی ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ پھر بھی برادرم عزیر انجم کی خواہش کے احترام میں، میں نے قلم اٹھایا ہے۔

عزیر انجم موتی ہاری سے چند کیلومیٹر کے فاصلے پر قائم ایک چھوٹے سے گاؤں بِسونیا سے اپنی شناخت کے لیے اس طرح نکلے ہیں کہ سامنے صرف سفر ہے اور یقین واعتماد کے ساتھ ان کا سفر جاری ہے، وہ افسانوں کے ذریعہ زندگی کے مختلف پہلوؤں

کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور آسمان ادب پر درخشاں ستاروں کے درمیان جھلملانے کی سعی کے ساتھ اپنے منفرد مقام کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ عام فہم سادہ اسلوب اور بیان کی ندرت انہیں عام قاری تک پہنچنے میں مدد کر رہی ہے۔ ان کا ہر افسانہ ان کی حساس طبیعت کا گواہ ہے۔

ہنگاموں اور وحشتوں کے درمیان آج ہر شخص شہرت، عزت اور دولت کے تعاقب میں بھاگا جا رہا ہے۔ اس میں کسی کو کامیابی اور کسی کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ لیکن دنیا کی ظاہری چمک دمک انہیں اس قدر متاثر کرتی ہے کہ اپنے کچلے جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ خود سے متوجہ ہونے یا اپنے سے استفسار کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے اور وہ جاننا بھی نہیں چاہتے کہ ان کے اس اندھی دوڑ میں کتنے لوگ روندے گئے۔ کتنے ان کی بے حسی کے شکار ہوئے اور کتنے کراہ اور تڑپ رہے ہیں۔ دنیاوی رنگ و روغن کا پیچھا کرنے میں فرد، سماج سے کٹ کر اپنے اندر کھو گیا ہے۔ دکھ سکھ کی تمام عبارتیں وہ صرف اپنے اور اپنے لیے ہی سمجھتا ہے۔ دوسروں کی دل شکنی سے ہی اپنے خوابوں کا محل تعمیر کرتا ہے اور بھول جاتا ہے اپنی ذمہ داریوں کو۔ غیروں کے لیے بھی شفقت اور مہربانیوں کو آزادی کو نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی حاکم اور محکوم والی ذہنیت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ ظلم و بربریت کی ساری داستانیں آج بھی روا ہیں۔ سب اپنے ہیں، مگر کوئی شناسا نہیں۔ تنگ ہوتی زمین اور آدمیوں کا بڑھتا سیلاب اور فرش سے عرش تک پھیلتی آلودگیاں، آلودہ سیاست کی غیر شفاف بساط پر ٹیڑھی چالوں کے سبب نمائندے ہی غیر محفوظ ہیں اور جنتا کی محافظت کی بجائے اپنی حفاظت میں لگے ہوئے ہیں۔ گویا نفرت کی راج نیتی میں کمزور و ناداروں کی بلی چڑھ رہی ہے اور ہر سو ایک کہرام سا ہے۔ بدلتے وقت اور رجحانات کی تلوار نے تہذیب کے لباس کو تار تار کر ایٹمی طاقت بننے کی ہوڑ لگا دی ہے۔ مساوات اور غریبی ہٹاؤ کے کھوکھلے نعروں نے تفریق کی بے شمار دیواریں کھڑی کردی

ہیں۔ جرم کی دنیا کے بے تاج بادشاہ، طاقت اور پیسے کے بل پر دیش کا تاج حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کررہے ہیں۔ اس طرح مختلف رنگ و روپ میں واقعات، حادثات اور سانحات بکھرے پڑے ہیں۔ عزیر انجم نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ انہیں افسانوی پیرہن عطا کر افسانوں کا جہاں آباد کیا ہے۔ ایک ایسا حصار قائم کیا ہے جس سے قاری کا باہر نکلنا مشکل ہوگا۔

عزیر انجم نے اپنے افسانوں کے ذریعہ انسانی اور سماجی مسائل کو پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ زندگی کی تلخ اور کربناک حقیقتیں جن سے ہم روز روبرو ہوتے ہیں اور انہیں جھیلتے بھی ہیں، ہمارے درمیان پھیلے تمام المیہ عزیر انجم کے بیان میں موجود ہیں۔ ہر افسانہ ہمارے اطراف میں روزانہ رونما ہونے والے واقعات کا فسانہ ہے۔ گویا اپنے وقت اور عہد کو سمجھنے کا ہنر ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بڑی متانت اور سنجیدگی سے وہ اپنے فن کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں جو ان کے درخشاں مستقبل کی ضمانت ہے۔

ازدواجی زندگی کو شادماں اور کامیاب بنانے میں اعتماد اور اعتقاد ہی اہم کردار نبھاتے ہیں اور جب کسی ایک کا یقین دوسرے سے اٹھ جاتا ہے تو حیات تنگ ہوجاتی ہے اور جب سچائی کا پتہ چلتا ہے تب تک دیر ہوچکی ہوتی ہے۔ عزیر انجم نے اپنے افسانہ ''شیشہ ٹوٹ گیا'' میں اسی کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

''انجام خدا جانے'' کا کم سن نادان معصوم بھولا اسکول جانے کی بجائے اپنے اور پریوار والوں کے پیٹ کی خاطر سانپ کا تماشہ دکھانے کو مجبور ہے۔

ہمارے نیتا کہتے کچھ اور عملی زندگی میں کرتے کچھ ہیں۔ ان کے قول وفعل میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ غریبی ہٹانے کا کھوکھلا نعرہ دیتے ہیں۔ صحیح معنوں میں غریبوں کے ساتھ ان کی کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ افسانہ ''مسافر'' کے نیتاجی باتیں بڑی بڑی کرتے ہیں لیکن بچا ہوا کھانا بھکاری کو نہ دے کر کتوں کو دیتے ہیں۔

ساری دنیا میں خواتین بیداری مہم زوروں پر ہے۔ انہیں مردوں کی برابری کا

درجہ دینے کی حمایت ہورہی ہے۔ ان کے اوپر ہونے والے ظلم وتشدد کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے کئی تنظیمیں متحرک ہیں تا کہ عورتوں کی آبرو اور عصمت محفوظ رہ سکے۔ لیکن افسانہ ''پگلی'' کی چگلی کو موت ملتی ہے اور اس کی محافظت میں دور تک پسرے سنانے میں ایک سسکی بھی نہیں۔

الیکشن کے دوران ہر پارٹی اپنے گن گان اور دوسروں کا بخیہ ادھیڑتی ہے۔ ذات پات کی سیاست کرتے ہیں جس سے امن وشانتی کو بھی خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ جھیل میں لاش کی خبر جیسے ہی پھیلتی ہے تمام چہرے فق ہوجاتے ہیں۔ فساد کا ڈر منڈلانے لگتا ہے۔ لیکن لاش کتے کی ہوتی ہے اس لیے سب راحت محسوس کرتے ہیں۔ بے چین و مضطرب ماحول پر سکون کی چادر تن جاتی ہے۔

اس طرح عزیر انجم نے سماجی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں افسانے تحریر کیے ہیں۔ گویا اپنے گرد ونواح پر ان کی نظر تیز ہے اور اس درمیان گزرتے ہر لمحہ کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ویسے انہیں ابھی اور مطالعے اور مشاہدے کی ضرورت ہے تا کہ وہ فن کی باریکیوں کو سمجھ سکیں اور مزاج و معیار کی بلندیاں طے کرسکیں جس سے ان کی فنی صلاحیتوں کا خاطر خواہ اعتراف ہو۔ وہ جتنی تب وتاب اور توانائی سے آگے بڑھ رہے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ وہ خود کو آگے لے جانے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

میری نیک خواہشات، تمنائیں اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

✪✪✪

شیشہ ٹوٹ گیا

وہ اداس ہے — مایوس ہے — اپنی زندگی سے۔ جب کہ چمن کی نکہت دل پذیر مشامِ شوق کو معطر و شاداب کر رہی ہے۔ ہر طرف نسیمِ سحر غنچوں سے اٹکھیلیاں کرتی صحنِ گلشن میں عنبر فشانی کر رہی ہے۔ بہارِ چمن میں پھولوں کے نرم نرم ہونٹوں پر شبنمی موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

بہاروں کا حسن اسے ڈستا ہے۔ وہ نیرنگیٔ زمانہ سے تنگ آ کر خود کو مایوسیوں کی گود میں ڈال چکی ہے — سماج اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ لوگ اسے کوستے ہیں۔ بعض وقت وہ بھوک سے نڈھال اور پیاس سے بے چین ہو جاتی ہے۔ ایک وقت وہ اپنے ہمسایہ کو آواز دیتی ہے، ذرا پانی لا دو! اس کا ہمسایہ انکار کر جاتا ہے اور آہستہ سے منھ بسورتا ہوا چل دیتا ہے۔ کبھی کبھی رات اس کے لیے ظالم بن جاتی ہے۔ رات گئے تک اسے نیند نہیں آتی۔ کبھی بستر پر بیٹھ کر روتی ہے۔ پھر بے چین ہو جاتی ہے۔ نہایت بے قرار ہو کر گھر میں دوڑنے لگتی ہے۔ ملک الموت کو روح نکالنے کے لیے آواز لگاتی

ہے۔ عجب منظر ہوتا ہے — وحشت ناک منظر — ڈر اور خوف کا منظر — زندگی کا خیال آتے ہی وہ خوف کھانے لگتی ہے۔

وہ دن بیتے نہیں — کوئی زمانہ گزرا نہیں کہ وہ خدا کے اس آسمان کے نیچے خوشیوں کے پھول سمیٹتی تھی — وہ گاؤں اور علاقہ میں حسین تھی۔ اس کا حسن علاقائی انقلاب تھا۔ واہ رے حسن! کل تک تم جس راہ میں بیٹھ جاؤ ہزاروں شیدائی تمہیں دیکھنے کھڑے ہو جائیں۔ اس کا پرشباب چہرہ مستقل تماشہ گاہ تھا۔ حسن کی متلاشی آنکھوں کا، اس کی آنکھیں قیصر وکسریٰ کے خزانے لٹانے کے بعد بھی دکھ جائیں تو سستی تھیں۔ آنکھیں کیا تھیں — مجنوں دیکھ لے تو لیلیٰ کو بھول جائے۔ فرہاد دیکھ لے تو شیریں یاد نہ آئے۔ ہیر دیکھ لے تو رانجھا کی پروا نہ کرے اور کرشن دیکھ لے تو رادھا کی آس ٹوٹ جائے۔

جب شباب آتا ہے تو ہزاروں دلفریبیاں اپنے خوشنما دامن میں سمیٹ لاتا ہے — جب وہ جوانی کی دہلیز میں داخل ہوئی تو ان گنت خواب بھی اس کے ہمسفر تھے — ڈھولک کے تھرکتے ہوئے ساز اور دوشیزاؤں کی مدھر آوازوں کے بیچ جب اس کی سہیلیوں نے اسے سرخ جوڑے میں سجا کر دلہن بنایا تو ان گنت خیالات اس کے دل میں کروٹ لینے لگے — جب میں اپنے دولہا کے گھر جاؤں گی تو کتنے ناآشنا چہرے مجھے دیکھنے آئیں گے۔ میری ساس میری نندیں مجھے دیکھ خوش ہوں گی۔ میری صورت دیکھ کر مجھ سے لپٹ جائیں گی۔ صاف ستھرا مکان ہوگا جس میں بٹھائی جاؤں گی، در و دیوار سے اجنبیت ٹپکے گی — پھر بھی وہ میرا گھر ہوگا۔ دروازہ پر مجھے عورتیں تھام لیں گی۔ میں شرمائی ہوئی قدم آہستہ آہستہ بڑھاؤں گی۔ میرے گھر میں ملنے والوں کی قطاریں بندھ جائیں گی۔ نندیں تیزی سے میرے کمرے میں آجا رہی ہوں گی، بچے مجھے گھوریں گے۔ پھر کچھ رات گزر جائے گی۔ میرا شوہر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوگا۔ وہ اپنی انگلیوں سے میرا گھونگھٹ الٹے گا۔

کتنا خوش ہوگا مجھے دیکھ کر۔ میری زلفوں سے کھیلے گا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر اپنی صورت دیکھے گا۔ وہ مجھ سے سرگوشیاں کرے گا۔ اس کی مدھر آواز خیالات کے پردوں کو چیرتی ہوئی کانوں سے ٹکرائے گی تو آبشار کے نغموں کا احساس ہوگا۔

رات اپنے دامن میں کئی ساعتیں سمیٹ چکی تھی۔ اس کا شوہر، حجلہ عروسی میں داخل ہوتا ہے اور چیخ پڑتا ہے۔

''کون ہو تم؟'' کیا لینے آئی ہو؟؟ تم کو میری عزّت سے کھیلنے کا کیا حق ہے؟ کیا حق ہے تم کو اپنا ناپاک وجود میرے کاندھوں پر رکھنے کا؟''

''چلی جاؤ! جاؤ وہاں جہاں تم نے اپنی زندگی چھوڑی ہے۔''

''تم اپنی جوانی کسی دوسرے کی دہلیز پر رکھ کر میری چوکھٹ کو داغ دار نہ کرو—!'' خدا کے لیے دور ہو جاؤ میری نظروں سے، ایک پل بھی تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا— چلی جاؤ! دور ہو جاؤ—!!''

وہ پوری قوت سے چلاّ رہا تھا۔ وحشت بھری آواز عصمتؔ کے پردہ سماعت کو مفلوج کر گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ سرخ۔ سرخ۔ سفید۔ سفید۔ وہ بے ہوش سی ہونے لگی۔ اضطراب بڑھا۔ بے چین ہوگئی۔

''خدارا ایسا نہ کہو۔ تم خواہ مخواہ مجھ پر برس رہے ہو۔''

''اُف! تم نے میرے ارمانوں کا خون کر دیا۔ کتنی امیدیں تھیں تم سے۔ میں نے کیا سمجھا تھا اور تم کیا نکلے۔''

''ایسی باتیں کہہ کر تم میرے دل کو نہ دکھاؤ—! آخر میری غلطی کیا ہے—؟'' عصمت نے شوہر کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔

''واہ! بڑی ہوشیار نکلیں۔ تم تو ایسے ان جان بن رہی ہو جیسے ایک قاتل چھری پھینک دے اور دامن سے خون کے دھبّے مٹا کر چلاّئے کہ قاتل کون ہے؟ قاتل کون؟؟؟'' منگنی کے بعد تم میری ہوگئی۔ میں نے تمہیں اپنی بیوی سمجھ رکھا تھا۔ لیکن تم تو

خالد کی ہو کر رہ گئی۔ خالد تمہارا خلیرہ بھائی ہے نا۔ تم اور وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ کیا لینے آتا تمہارے گھر—؟ تم اس کے یہاں کیوں جاتی رہی؟ میں نے تم کو ہمیشہ روکا۔ منع کیا کہ تم خالد سے نہ ملو۔ لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔ کبھی پڑھنے کا بہانہ لے کر۔ کبھی امتحان کے سوالات کا، کبھی کتابوں کا، کبھی کچھ کبھی کچھ— تم دونوں کی قربتیں بڑھتی رہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر باتیں کرتے رہے۔ نزدیکیاں بڑھتی گئیں۔ میرے شبہات یقین میں بدلتے گئے۔ میں تمہیں ڈانٹتا رہا۔ منع کرتا رہا۔ لیکن تم تھیں کہ میری باتوں کی پروا کیے بغیر خالد کی بانہوں میں لچکتی رہی۔ جاؤ—! تم اپنی محبت کے چراغ سے خالد کا گھر روشن کرو۔! اس کے نام پر محبت کا دیوتا بناؤ! پوجو خالد کو—! پوجو—!! اس سے پہلے کہ میرے جذبات.........تم دور ہو جاؤ یہاں سے۔"

قمر کی جذباتی آواز سے عصمت کے کان پھٹنے لگے۔ اس کا ایک ایک جملہ عصمت کے ذہن و دل پر پتھر برساتا رہا۔

خدا کے لیے ایسا نہ کہو میں نے صرف تمہیں اپنایا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں تمہارے سوا کسی کا تصور بھی گناہ سمجھا ہے۔ تمہارے علاوہ اگر میں نے کسی غیر مرد کو دیکھا ہو تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔ تم مجھ پر الزام نہ لگاؤ، شبہات کی بنیاد پر میری زندگی میں زہر مت گھولو—!

عصمت کے دل پر لگی چوٹ آنکھوں سے آنسو بن کر رخسار پر ڈھلنے لگی۔ وہ دل گرفتہ ہوگئی۔

وقت کا طائر محو پرواز رہا۔ دن گزرتے رہے۔ عصمت نے قمر کے خیالات کو بدلنا چاہا۔ لیکن شبہات نے قمر کا دامن نہ چھوڑا۔ میاں بیوی کے احساسات و جذبات ایک دوسرے کے لیے سرد پڑتے رہے۔ دونوں کے درمیاں دوریاں بڑھتی رہیں۔ شادی کے تین ماہ گزر گئے— ایک دوسرے کی زندگی تاحدِ نظر ریت ریت دکھائی دیتی رہی۔

زندگی لامتناہی کانٹوں کے حصار میں نظر آتی۔ شباب کی گود میں مسکراتے پھولوں کے بدلے کانٹے— اداس زندگی— مایوس شباب۔ آنسو، آہیں، سسکیاں کراہیں۔

شام کا وقت ہے۔ ڈاکیہ ایک پارسل قمر کے ہاتھوں میں دیتا ہے قمر کھولتا ہے۔ شادی کا ایک سرخ جوڑا اور ایک خط— خط پڑھتا۔

عصمت!

خوشیاں قدم بوس ہوں!

میں تم سے سینکڑوں میل دور ہوں اس لیے شادی میں شریک نہیں ہوسکا۔ اللہ کرے تمہارا شوہر تمہارے دامن میں موتیاں بھردے۔ اور ہاں۔! اپنے شوہر کا خیال رکھنا۔ شوہر کی خدمت بھی عبادت ہے۔ اس کی وفاشعاری اپنا شیوہ سمجھنا۔ شوہر کو خوش رکھنا۔ اس کا دل نہ دکھانا۔ شادی کا جوڑا قبول کرو۔! خدا کرے تم دونوں کی زندگی شاداب ہو۔

فقط تمہارا بھائی— خالد

خط پڑھتے ہی قمر کے ہاتھ سے پارسل پیکٹ گر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے میں نے عصمت کے ساتھ کیا کیا۔ میں نے سیتا اور مریم کے تقدس کو گالی دی ہے۔ وہ پارسل کا پیکٹ لے کر عصمت کی طرف دوڑتا ہے تاکہ وہ اس کے پیر پر سر رکھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکے۔ لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ خاموش ہو چکی تھی۔

وہ سوگوار ہو جاتا ہے۔ پچھتاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے— اپنی بربادی کا الزام کس کو دے۔ عصمت کو؟ سماج کو؟ قسمت کو؟ آزادی کو ترقی یافتہ زمانہ کو—؟ یا پھر ذہن و دل میں پھٹکنے والے شبہات کو؟؟

⚪⚪⚪

انجام خدا جانے

ساون کا مہینہ۔ برسات کا موسم۔ آسمان میں چھائی کالی گھٹائیں۔ مستی میں جھومتے گاتے بادل۔ رہ رہ کر چمکتی بجلی۔ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اڑتے آوارہ بادلوں کے ٹکڑے۔ پانی کی ہلکی ہلکی پھوار۔ آسمان سے زمین پر گرتی ہوئی پانی کی بوندیں۔ مستی و کیف میں سرشار ناچتے گاتے بھیگتے بھاگتے جوان جوڑے۔ بارش کی رم جھم۔ بھیگتے بدن۔ پارک میں جھولے اور جھولے پر بیٹھی دوشیزائیں اور پھر جھولا جھلاتے عاشق کے ہاتھ۔ لبوں پر مچلتے ساون کے گیت۔ ان تمام حالات و کیفیات سے بے نیاز گیارہ بارہ سال کا لڑکا پٹنہ کے گاندھی میدان میں ہاتھوں میں ڈگ ڈگی لیے بجا رہا تھا۔ زور زور سے چلا رہا تھا۔ آگیا...... آگیا بھائی بھولا سانپ والا آگیا...... آؤ دیکھو...... سانپ کا کھیل دیکھو...... ناگ کا کھیل دیکھو...... دیکھو بھولا کیسا کھیل دکھاتا ہے۔ ڈگ ڈگ کی آواز سن کر لوگ اس کی طرف مڑنے لگے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک بھیڑ اس کے چاروں طرف جمع ہوگئی۔ وہ درمیان میں کھڑا ہو کر کھیل دکھانے لگا۔

ہاتھوں میں بانسری تھام کر اس نے بجانا شروع کردیا۔ سامنے رکھی ہوئی سانپ کی پٹاری سے پھنکارتا ہوا ایک سانپ نکل پڑا۔ اُس نے بانسری کی آواز تیز کردی۔ سانپ مدہوشی میں ناچنے لگا۔ پھر اُس نے سانپ کو پیار سے سہلایا۔ بانسری پھینک دی اور آرام سے سانپ کو اٹھا کر گردن میں لپیٹ لیا۔ پھر اُس نے سانپ کو جسم میں رسی کی طرح لپیٹا۔ سانپوں سے کھیلنے لگا۔ سانپ کے منھ کو اپنے منھ میں رکھ کر چلانے لگا۔ ماردے ڈنک ناگ بابا...... ماردے ڈنک ناگ بابا...... ماردے ڈنک۔

نہیں نہیں...... لڑکا ایسا مت کر...... نہیں نہیں...... ایسا مت کر...... تیری جان چلی جائے گی۔ بھیڑ میں سے ایک بوڑھے آدمی نے گھبراتے ہوئے آواز لگائی۔ ''ارے لڑکا تو مرجائے گا۔''

''نہیں بابا نہیں...... مجھے نہیں مرنا'' — آپ مت ڈرو۔ بھولا کو سانپ کچھ نہیں کرے گا۔ میں بچپن سے سانپوں سے کھیلتا ہوں۔''

وہ اپنا کرتب دکھانے میں بے خوف و خطر مشغول تھا۔ کبھی بانسری بجاتا۔ کبھی ڈگ ڈگی بجاتا۔ کبھی سانپوں سے کھیلتا۔ تماش بین ایک روپیہ دو روپے سامنے بچھائی ہوئی میلی چادر پر پھینک دیتے — میں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچنے لگا تھا۔ کیا واقعی یہ بچہ ہے۔ نہ شوخی نہ چنچلتا نہ مسکراہٹ نہ بچوں والا کوئی بھی احساس۔ حالات نے اس کے چہرے سے بچپن کی معصومیت چھین لی ہے۔

کچھ لوگوں کا دھیان پوری طرح اُس کی طرف لگا ہوا ہے۔ کچھ لوگ خطرناک کھیل دیکھ کر سہمے ہوئے کھڑے ہیں۔ کہیں سانپ خدانہ خواستہ اُسے ڈس لے۔ تو کیا ہوگا اس لڑکے کا۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی ہے۔ کچھ لوگ زیرِ لب مسکرا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کی دلچسپی اِس کھیل میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

میں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ کچھ محسوس کررہا ہوں۔ ذہن و دل میں طرح طرح کے احساسات جنم لے رہے ہیں — اس عمر میں دیش کے نونہالوں کے ہاتھوں

میں زہریلے سانپوں کو لے کر پیٹ کی خاطر خطرناک کھیل دکھانے والے بازی گر بن کر رہ گئے ہیں۔ زہریلے سانپوں کی پھنکاروں سے لے کر ڈھولک کی تھاپ پر بازی گری دکھلاتے ان بچوں کا بچپن، بھوک کی آگ میں جل کر راکھ ہوتا جارہا ہے۔ ایسے بہت سے کنبے یہاں رہتے ہوں گے جو خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے ہوئے اپنے بچوں کے مستقبل کو روٹی کی قربان گاہ پر رکھ دیتے ہوں گے۔

جب کھیل ختم ہوگیا تو میں وہیں رکا تھا۔ سارے لوگ چلے گئے تو میں نے ازراہِ ہمدردی بھولا سے اس کے حالات پوچھے۔

''میں بچپن سے جان جوکھم میں ڈال کر پیسے کماتا ہوں صاحب!'' بھولا کے چہرے پر اُداسی تھی۔ غریب گھرانہ میں پیدا ہوا میں خانہ بدوش ہوں صاحب جی! ہم لوگ گاؤں گاؤں، شہر شہر گھومتے تماشہ دکھاتے اپنی زندگی گزاردیتے ہیں۔ چوک چوراہوں سے لے کر گاؤں کی گلیوں میں سانپ اور بندر کا کھیل دکھانے سے لے کر جان لیوا بازی گری کرتے ہیں۔

ہم خانہ بدوش لوگ بھیڑ میں مداری اور جمورا کا کھیل دکھاتے ہیں صاحب!! ہم لوگ پیٹ کی خاطر یہ سب کرتے ہیں۔ میں چپ چاپ سن رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اُس کے درد میں ڈوب گیا ہوں — ایسی عمر اور ایسا بوجھ۔ سانپ کی پٹاری کا بوجھ بھی جس عمر میں نہ اٹھنے پاوے — لیکن اپنے کنبے کا بوجھ کاندھے پر لادے چل رہا ہے بھولا۔ اس عمر میں گھریلو ذمہ داریوں نے اس سے اس کا بچپن چھین لیا ہے۔ صبح سے شام تک ڈھول پھانکنے اور جان کو خطرہ میں ڈال کر لوگوں کا منورنجن کرنے کے باوجود یہ کچھ خاص نہیں کما پاتا ہوگا۔ کبھی کبھی تو دو وقت کی روٹی بھی نہیں جٹا پاتا ہوگا یہ بھولا سانپ والا۔ میرے اندر جذبات امنڈنے لگے۔ بچہ مزدوری قانون سے لے کر ترقیات کے تقریباً تمام منصوبوں کے منہ چڑھاتا یہ بچہ، بچپن میں بڑھاپے کا احساس لیے زندگی کا بوجھ ڈھو رہا ہے۔ بستہ لادنے والی پیٹھ ذمہ داریوں کے بوجھ سے ٹوٹ

رہی ہے۔ گھر کی غریبی، دو وقت پیٹ کی روٹی اور کنبہ کے بوجھ نے اِسے بچپن میں ہی گلی گلی جان ہتھیلی پر لیے بھٹکنے کو مجبور کر دیا ہے۔ ایسے میں کیسا ہوگا اس بچہ کا مستقبل؟ یہ سماج کے سامنے ایک اہم سوال بن کر کھڑا ہے۔ کیا یہ ہمارے جیسا گوشت پوست کا آدمی نہیں ہے؟ کیا اس کے خون کا رنگ لال نہیں ہے؟ اگر ہاں تو پھر کیوں ہماری زمین میں اس سے اس کا بچپن چھین لیا گیا ہے؟ کیا ان مسائل کے حل کسی دوسری دنیا کے حاکم کے ہاتھ میں ہے؟ ان بچوں کے مسائل کی جڑ سماجی اور اقتصادی نابرابری کی گہرائی میں اندر تک پھیلی ہوئی ہے۔ کیا اس طرح سماج کے بچوں کا بچپن یوں ہی غریبی کی زندگی جیتے گمنامی کے اندھیرے میں دفن ہو جائے گا؟؟

شام ڈھلنے لگی تھی۔ میں اپنے گھر کی طرف کچھ سوچتے ہوئے چلنے لگا۔ لال پیلی بتی والی گاڑیاں روڈ پر رواں دواں تھیں اور اس میں موٹے موٹے جسم والے سفید پوش بیٹھے ہوئے تھے۔

✪✪✪

مسافر

یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ ہر آدمی یہاں مسافر ہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک کا سفر۔ ہاں پھر یہیں ختم نہیں ہو جاتا یہ سفر بلکہ موت اور پھر اُس کے بعد اٹھایا جانا۔ یعنی حیات بعد الممات۔ کل، آج اور کل۔ ہاں وہی کل جو گزر گیا۔ ہمیں یاد آئے گا ہی۔ جس میں ہماری یادیں دفن ہیں۔ لیکن اس گزرے کل پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو رہا۔ ہم اُس میں چاہنے کے بعد بھی ذرہ برابر تبدیلی نہیں لا سکتے۔ ہم جو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ آنے والے کل میں ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ ہر آدمی کا سفر جاری ہے۔ اپنی تقدیر کو سنوارنے میں منہمک ہے۔ خوشنما آرزوؤں اور مثبت عزائم کو تدبیر کے دست زرّیں سے عمدہ سانچے میں ڈھالنے کے لیے انسان معروف کار ہے۔ اگر ہم اُس کل کو جو ہمارے ہاتھ سے گزر گیا ہمہ وقت فکرمند رہیں گے تو یہ دانشمندی سے دور کی بات ہوگی— بھول جاؤ کل کی باتوں کو چلو آگے بڑھیں— یعنی سفرطویل— کامیابی کا سفر— عزم مصمّم— زندگی کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کا— سفرطویل ہے یارانِ میکدہ کے لیے۔

انسانی زندگی ایک دوراہے پر کھڑی اپنی منزل کی جانب دیکھ رہی ہے۔ سماج میں دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک مجبور و بے بس، دوسرا مراعات یافتہ۔ مراعات یافتہ طبقہ ہر دور میں کم تعداد میں رہا ہے۔ یعنی سماج میں مٹھی بھر لوگ۔ وہ ہر طرح کے وسائل خواہ قدرتی ہوں یا انسانوں کے بنائے ہوئے ہوں، پر قابض رہے ہیں۔ مراعات یافتہ طبقہ آج بھی اپنے نیچے اور زیردست لوگوں کو دبائے رکھنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ماجرا عجب ہے۔ آدمیت کے وقار کو بلند کرنے کی باتیں بھی خوب کی جاتی ہیں۔ تفریق کو مٹانے کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔ آدمی اور آدمی میں فرق کرنا انسانیت کا قتل کرنا ہے۔ چاہے یہ عمل جس نام سے کیا جائے۔ سماج میں مساوات اور انصاف کو عام کرنے کا سفر آج بھی جاری ہے۔

میں بھی روزانہ صبح سے شام تک سفر پر رہتا ہوں۔ دن بھر اپنے تجارتی کام سے شہر کا چکر لگاتا ہوں۔ صبح گھر سے نکلتا ہوں تو دن بھر کے سفر کے بعد رات کو ہی گھر لوٹ پاتا ہوں۔ آج کا سفر راجدھانی کا تھا۔ ٹرین کھل چکی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک نیتا جی غریبوں پر ہونے والے مظالم پر دکھ کا اظہار کر رہے تھے۔ غریبوں اور دبے کچلے عوام کا مسلسل استحصال کیا جا رہا ہے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ نیتا جی مسلسل بولے جا رہے تھے۔ ان کی زبان قینچی کی طرح تیز چل رہی تھی۔ ہمارے ملک میں یہ بیماری پرانے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ غریبی کو مٹانے کے لے ہم سب کو آگے بڑھنا چاہیے — مساوات کا قیام ہو یہ ہماری کوشش رہنی چاہیے۔ مظلوم طبقات کو آگے بڑھایا جائے۔ سماج کے دبے کچلے افراد اور گروہوں کو سماج کے دیگر طبقات کے برابر لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے جائیں۔ تعلیمی اداروں میں اِن کے داخلہ کو یقینی بنایا جائے۔ ان کی معاشیات کے سدھار کے لیے حکمت عملی اپنائی جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کی ذہنیت تبدیل کی جائے۔ سماج کے کسی فرد کو بھوک سے مرنے نہیں دیا جائے۔ تمام لوگ خاموشی سے نیتا جی کی بات سن رہے

تھے۔ ان کی آواز بھاشن کا روپ اختیار کرگئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی بات سننے کے لیے ہی لوگ اس ڈبہ میں بیٹھے ہوں۔ وہ خوش تھے اور بولے ہی چلے جارہے تھے۔ حقیقی سماجی انصاف اُس وقت قائم ہوگا جب ہماری ذہنیت تبدیل ہوگی— ٹرین بہت دیر چلنے کے بعد ایک اسٹیشن پر رکی۔ نیتا جی نے اپنے خوبصورت تھیلہ سے پانی کی بوتل اور ٹفن کیریئر نکالا اور کھڑکی کی جانب گھوم کر کھانے لگے۔ اسٹیشن پر بھیڑ بھاگ رہی تھی۔ مسافر ادھر سے اُدھر آجارہے تھے۔ سب ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کی فکر میں سرگرداں— نیتا جی ان سب سے بے نیاز ہوکر انڈے پراٹھے مزے لے لے کر کھائے جارہے تھے— ٹھیک اسی وقت ایک بھیک مانگنے والا ہاتھ میں کٹورہ لیے کھڑکی کے پاس آیا اور کھانا مانگنے لگا۔ نیتا جی کا چہرہ غصہ سے لال ہوگیا— ''یہ گندے لوگ چین سے کھانے بھی نہیں دیتے۔''

چل دور جا۔ یہ بھیک منگے کرتے تو کچھ ہیں نہیں چلتے مسافروں کو خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں— ''میں کر بھی کیا سکتا ہوں صاحب جی۔'' بھکاری نے کٹورہ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ایک پاؤں سے مجبور ہوں۔ لنگڑا ہوں۔ کچھ کر بھی نہیں سکتا صاحب!'' بھکاری کی بات سن کر وہ غصہ سے بھڑک اٹھے۔ کرتے تو کچھ ہیں نہیں اور منھ لگانے میں ماہر ہوتے ہیں یہ لوگ۔ انہوں نے بھکاری کو ڈانٹ پلائی— چل دور ہٹ!! بچے ہوئے انڈے پراٹھے سامنے پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوئے کتے کی جانب پھینک دیے اور بڑے اطمینان سے اپنے ہاتھ منھ دھوئے۔ سفید تولیہ نکالا ہاتھ منھ پونچھا— لمبی ڈکار لی۔ بنڈی اور کرتا کے نیچے ہاتھ لگا کر توند سہلانے لگا۔ سامنے کھڑا بھوکا بھکاری اپنی ڈبڈباتی حسرت ناک آنکھوں سے کتے کو دیکھ رہا تھا۔ ڈبہ میں بیٹھے مسافر اس بہہ روپئے شخص کے گفتار اور کردار کا جائزہ لے رہے تھے جو ابھی تو گفتار کا غازی بن کر ملک سے غریبی کا خاتمہ کررہا تھا۔ ٹرین کھل چکی تھی۔ مسافر اُن کے کردار اور گفتار پر آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے۔

✪✪✪

پگلی

شہر میں خواتین بیداری کارواں نکالا گیا تھا۔ کارواں کا مقصد خواتین کو اپنے حقوق سے واقف کرانا تھا۔ ملکی مسائل کے تئیں انہیں باشعور بنانا تھا۔ معاشرتی اصلاح اور خواتین کی اپنے حقوق سے آگہی جیسے مقاصد کو بنیاد بناتے ہوئے کارواں کا آغاز ملک کی راجدھانی سے ہوا تھا۔ ہر کام کا کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلتا ہے۔ کارواں خواتین میں بیداری اور جوش و جذبہ پیدا کرنے میں موثر رہا— عورتوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے کے لیے نصف درجن تنظیمیں مختلف ناموں سے شہر میں قائم ہوگئی تھیں۔

ایک مہینہ قبل خواتین پر ظلم و تشدد کے خلاف ''خواتین بیداری تنظیم'' کے زیرِاہتمام جلوس نکالا گیا۔ جلوس میں سیکڑوں خواتین اپنے ہاتھوں میں بینر اور پلے کارڈ لیے ہوئی تھیں جن پر اردو، ہندی اور انگریزی میں نعرے لکھے ہوئے تھے۔ جلوس شہر کے مختلف راہوں سے گزرتا ہوا ٹاؤن ہال پہنچ کر جلسہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ہال میں دور دراز سے آئی عورتوں نے بھیڑ میں اضافہ کردیا تھا۔ پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ کہیں بھی

تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ایک خوش پوش خاتون لیڈر کا بھاشن ہو رہا تھا۔ پریس فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے خاتون لیڈر کی تصویریں اتار رہا تھا۔ پریس گیلری میں بیٹھے اخباری نمائندے نوٹ بک میں جلسہ کی کارروائی نوٹ کر رہے تھے۔ تالیوں کے درمیان خاتون لیڈر کی تقریر تیز ہونے لگی تھی۔

تم یہ یاد رکھو کہ یہ بھارت ہے یہاں کی عورت نہ تو کبھی مغربی تہذیب کی دلدادہ رہی ہے اور نہ ہی کبھی رہے گی۔ ہماری تہذیب ہی ہماری وراثت ہے۔ اس پہچان کو غیر ملکی تہذیب سے بچا کر رکھنا ہے۔

تالیاں...... تالیاں...... نئی نسل کی نوجوان لڑکیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تمہیں جھانسی کی رانی، کستوربا اور رضیہ سلطانہ بن کر اپنے ملک کا نام روشن کرنا ہے۔

اگر ہم اپنی تہذیب کو بھلا دیں تو جانور اور آدمی میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔ عورت اپنی عزت کردار کی بلندی سے پاتی ہے۔ تعلیم یافتہ خاتون میں شائستگی خود بہ خود آجاتی ہے۔ اس لیے خاتون میں تعلیم کی اہمیت بتانے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کے کاندھوں پر ایک کنبہ سے لے کر پورے سماج کا بوجھ ہوتا ہے۔

تالیاں...... تالیاں...... خواتین بیداری زندہ باد...... خواتین بیداری زندہ باد......! کے پرجوش نعروں سے ہال گونج رہا تھا۔

صدر جلسہ نے دوسری خاتون لیڈر کو مائک پر آنے کی دعوت دی۔ کسے ہوئے جنس پینٹ اور ٹی شرٹ میں ملبوس خاتون لیڈر اپنی گرم تقریر سامعین کے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔ ہمارے دیش کی تہذیب کا تعارف دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ملک کی اپنی ایک امتیازی شناخت ہے۔ دستور میں مرد اور عورت دونوں کو برابری کا درجہ دیا گیا ہے۔ ہمیں مل کر سرکار سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ سرکار ایک ایسا سخت قانون بنائے جو عورت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور زنا بالجبر کرنے والوں کو سخت سے

سخت سزا دلانے میں معاون ثابت ہو۔ یہ آواز صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں بلکہ سماجی سطح پر بھی اٹھائی جانی چاہیے— ایک بار پھر زوردار تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ہال گونج اٹھا۔

عورتیں ہمارے سماج کا ہماری قوم اور ہمارے ملک کا بہت بڑا حصہ ہیں۔ ملک تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ ہمارے سیاست داں کرسی کی سیاست میں لگے ہیں۔ کوئی مذہب خون خرابہ کرنے کو نہیں بتلاتا۔ ہر مذہب بے گناہ انسانوں کے گشت و خون سے منع کرتا ہے۔ سیاسی بازی گر مذہبی جذبات ابھار کر آپس میں لڑاتے ہیں۔ اپنی کرسی کے لیے فرقہ وارانہ فسادات بھڑکائے جاتے ہیں۔ بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں۔ عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں— اور پھر ہر موڑ پر عدم تحفظ کا احساس اُس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو منجمد کرتا رہتا ہے۔

یہاں کی تہذیبی، سماجی روایات اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکلتا جا رہا ہے۔ آزاد ملک میں عورت کی یہ دُردشا ہو۔ مٹی تیل چھڑک کر جلائے جانے، جہیز کی کمی میں موت کے گھاٹ اُتار دیئے جانے جیسا گھٹیا اور انسانیت سوز سلوک کیا جائے۔ عورت کے سہاگ اور ماں کی ممتا کا مذاق اڑایا جائے۔ عورت کے جسم کو خواہشات نفس کی تکمیل کا آلہ سمجھا جائے۔ عورت کی عزّت و آبرو پر دن کے اُجالے میں حملے کیے جائیں—
''خواتین بیداری تنظیم'' کے اراکین اِسے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔

خواتین کے حق میں کی جا رہی تقریر— کھچا کھچ بھرا ہال اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ مقررین کو جوش و جذبہ دلا رہا تھا— ایک بار پھر زوردار تالیوں نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ یکے بعد دیگرے درجن بھر خاتون لیڈروں نے اپنی اپنی تقریر کے جوہر دکھائے۔

کل ہو کر اخبار میں جلسہ کی کارروائی کی رپورٹ چھپی تھی۔ خاتون لیڈروں کی تصویریں چھپ چکی تھیں۔ اپنی اپنی تصویر اور اپنے اپنے نام اخبار میں دیکھ کر خاتون میں خوشی کی لہر تھی— لیکن وہیں تصویر کے دوسرے رُخ کی صورت جاں سوز تھی۔

شہر کی سڑکوں پر پچھلے تین چار مہینوں سے بھٹک رہی ایک گمنام، بے گھر، بے سہارا پھٹے اور گندے کپڑے میں لپٹی ہوئی نیم برہنہ پگلی لڑکی کو ان دنوں روز بہ روز زنا بالجبر کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ دبلی پتلی لگ بھگ ۲۵ سال کی عمر والی اس پگلی کے ساتھ ہونے والا زنا بالجبر عموماً اجتماعی ہوتا ہے۔ یہ پگلی لڑکی کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟؟ کس ذات اور دھرم کی ہے؟؟؟ یہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

لیکن اس بے بس پگلی کے جسم کو بھوکے بھیڑیئے روز رات کو بھنبھوڑتے ہیں۔ یہ بہت سے لوگوں کو پتہ بھی نہیں۔ لیکن زانیوں کے خلاف فریاد کر سکتے ہیں۔ مجبور اس پگلی لڑکی کی خبر لینے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ تو انتظامیہ کو اس کی فکر ہے اور نہ ہی خواتین بیداری کا دم بھرنے والی رضا کار تنظیم کو ہی اس کی چنتا ہے۔ نتیجتاً روز زنا بالجبر کا دکھ جھیلنا اس کی مجبوری بن گئی۔ اسی شہر میں گزشتہ سال جسم کے بھوکے سماج دشمن عناصر کے ذریعہ ایک پگلی کو سامو ہک بلاتکار کے بعد موت کے گھاٹ اتار کر پھینک دیا گیا تھا۔ کہیں اِس پگلی کا حشر بھی اُسی پگلی جیسا نہ ہو۔ ایک چائے خانہ میں دو چار لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ زانیوں کے ہوس کا شکار ہوتے ہوتے پگلی حاملہ بھی ہوگئی۔ کون اٹھائے گا اس کے بچّہ کا بوجھ......؟ کس کا ہوگا یہ بچہ؟؟ اس بچہ کا مستقبل کیسا ہوگا؟؟؟ یہ پگلی نہ تو گونگی ہے اور نہ ہی بہری۔ منھ کھولتی ہے تو گھنٹوں بڑبڑاتی رہتی ہے۔ پھر بھی اپنے بارے میں پوچھے گئے سوالوں کا جواب نہیں دے پاتی ہے۔ بے سر پیر کی باتیں کرنا ہی اس کی پہچان بن گئی ہے۔ دن بھر شہر کے مختلف بازاروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں دکانداروں سے مانگ لیتی ہے۔ جو مل گیا کھا لیتی ہے۔ دیر رات تک بھٹکنے کے بعد بنا اوڑھنا بچھونا کے کہیں بھی زمین پر سو جاتی ہے لیکن وہاں سے بھی رات میں کوئی نہ کوئی زبردستی اُسے اٹھا لے جاتا ہے۔ جسم کی پیاس بجھاتا ہے پھر صبح ہونے سے پہلے ہی بھگا دیتا ہے۔ جب سے یہ پگلی یہاں آئی ہے تب سے مقامی لفنگے جرأت کو اٹھا لے جاتے ہیں اور اُسے جنسی ہوس

کا شکار بنا کر چھوڑ دیتے ہیں— ایسے میں یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ جہاں خواتین بیداری کے نام پر پُر جوش تقریر سامعین کے کانوں میں انڈیلی جاتی ہے۔عورتوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے کے نام پر چندے بٹورے جاتے ہیں۔ وہیں اس بے بس مظلوم اَبلا پر کسی کا دھیان نہیں جاتا۔اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر کب تک اس طرح سے پگلی جنسی ہوس کا شکار ہوتی رہے گی۔ کیا زنا بالجبر کو سنگین جرم کا درجہ دینے والے اس مہذّب سماج کا کوئی نگہبان اس اَبلا کی عزت بچانے آگے آئے گا؟ آخر کب تک ہوس کا شکار ہوتی رہے گی بھٹکتی پگلی؟

پھر ایک صبح سورج خوفناک چہرہ کے ساتھ نمودار ہوا— پگلی کی لاش روڈ کے کنارے پڑی تھی۔ وہ مرچکی تھی۔سبھی لوگ مہر بہ لب تھے۔ ہر طرف پُر اسرار خاموشی تھے۔

✪✪✪

لاش

خون ہی خون — ! لاش ہی لاش — !! آگ ہی آگ — !!! انسانیت کا خون، سیاست کا خون — اولاد کا خون — ملک کا خون — مذہب کا خون — یہ خون ہے اِس دھرتی کا، دھرتی پر بسنے والے ہر دھرم اور ذات کا۔

سیاسی جھنڈے کے نیچے اسٹیج سجایا گیا تھا۔ فسادات سے چور چور ہو کر سامعین کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ میں ہر دھرم اور ہر ذات کے لوگ تھے۔ نرم دل کے لوگ تھے اور گرم دل کے لوگ بھی۔ حکمراں پارٹی اور اپوزیشن پارٹی کے کھدّر پوش بھی تھے۔ سرگرم سیاسی کارکنوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی اور سماجی کارکن بھی پیش پیش تھے۔ دھارمک پرتیندھی بھی گیروے وستر میں آئے تھے تو سفید پوش مذہبی رہنما بھی پان کی گلوریاں چبا رہے تھے۔ ہر طبقہ کے لوگوں کا اژدہام تھا۔ بھاشن ہو رہا تھا۔ ہر دل کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنا گرم گرم بھاشن سننے والوں کے کانوں میں انڈیل رہے تھے۔

''ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ملک کو کھوکھلا بنا رہے ہیں۔ آزادی کے بعد ہر

سال سیکڑوں فسادات ہوتے ہیں— خون کی ہولی، راکھ کا ڈھیر، ٹوٹی دیواریں، روتے بلکتے بچے، بے سہارا بیوائیں، آنسوؤں اور آہوں کا سیلاب، یہی سب تو رہ گیا ہے ہمارے ملک میں— مسکینوں کو مکان نہیں، نوجوانوں کو روزگار نہیں، قتل، خون، غارت گری اب یہی سب ہے شاید، اس ملک کا مقدر؟ مٹھی بھر شر پسند ہمارے دیش کو توڑنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دیش میں دوسرے ملکوں نے اپنا ایجنٹ بھیج رکھا ہے جو چاہتے ہیں کہ ہم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے، یہ دیش مہاتما گاندھی کا ہے، یہ دیش، بھگت سنگھ، مولانا آزاد، اور خان عبدالغفار خان جیسے ویر بہادروں کا ہے۔ ہم ذات پات کے نام پر سیاست نہیں ہونے دیں گے، دیش میں سیاست کی دُکان چمکانے کے لیے مذہب کی مہر ہم نہیں لگانے دیں گے۔ دیش کے غدّاروں کے چہرے سے چادریں اتار پھینکیں گے۔'' تالیاں...... تالیاں...... تالیاں.........

واہ...... واہ...... بہت خوب...... بہت خوب..........

''ہمارے دیش میں کچھ سیاسی لوگ ہیں جو سیدھے سادھے دیش واسیوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ کبھی کوئی بابری مسجد کے لیے چلّاتا ہے تو کبھی کوئی رام مندر کا ہنگامہ کھڑا کرتا ہے۔ کبھی کوئی بیک وارڈ کا نعرہ لگاتا ہے تو کبھی کوئی فارورڈ کے لیے شور مچاتا ہے— کہیں کوئی ہندو سکھ کو مارتا ہے تو کہیں کوئی سکھ ہندو کو۔ ہندو مسلمان کا خون پیتا ہے تو مسلمان ہندوؤں کے خون کے پیاسے ہیں۔ عیسائی بھی چین سے نہیں ہیں۔ دیش میں اتھل پتھل ہے— کچھ گھس پیٹھیے ہمارے ملک میں گھس آئے ہیں۔ پتہ نہیں ہماری سرکاری دن ہی میں کون سا خواب دیکھ رہی تھی؟ ابھی دیکھو یہاں فساد ہوگیا۔ کل دیکھو وہاں ہوگیا۔ پتہ نہیں ہمارے دھرم ادھیکاری کہاں سو رہے ہیں؟ مذہبی رہنما کنٹرول کیوں نہیں کرتے— سیاسی لوگ دکھ میں آنسو کیوں نہیں بہاتے! سماجی کارکن روکتے کیوں نہیں!!! اس دیش میں جو خون بہتا ہے وہ نہ ہندو کا ہے نہ مسلمان کا، نہ سکھ کا ہے نہ کسی عیسائی کی۔ اگر وہ خون بہتا ہے تو بھارت ماں کے سپوتوں کا۔ اس دیش

کے لاڈلوں کا۔ اس دیش کے ناگرک کا۔ ہم کسی دھرم کے ماننے والوں کا خون نہیں بہاتے — اگر خون بہتا ہے تو اس دھرتی کے سپوتوں کا — '' تالیاں...... تالیاں...... تالیاں......

''آؤ ہم سب مل کر قسم کھائیں کہ ہم کسی دھرم کے ماننے والوں کا خون نہیں بہائیں گے۔ ہم افواہ نہیں پھیلائیں گے۔ دنگے کا بائیکاٹ کریں گے، افواہوں پر کان نہیں دھریں گے، ہم تمام مذاہب سے لوگوں کو مذہبی دائرے میں رہ کر چین سے جینے کا حق دیں گے۔ ہم فرقہ پرستی کا خاتمہ کریں گے۔ وطن کے دشمنوں کو لاجواب کردیں گے۔ ہم پھر کسی کی لاش گرنے نہیں دیں گے۔ ہر ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ تالیاں...... تالیاں...... تالیاں......

''بند کرو بھاشن'' — ایک کھدر پوش اسٹیج پر چڑھتے ہی چلا اٹھا۔ ''تم یہاں دیش کی ایکتا کی بات کرتے ہو اور وہاں جھیل میں پل کے نیچے لاش پڑی ہے۔''

لاش...... لاش...... کیسی لاش —! کس کی لاش!! یکایک بھگدڑ مچ گئی۔ ایک لمحہ میں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ شور ہونے لگا۔ چلا چلی مچ گئی۔ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ منچ خالی ہوگیا — فیلڈ کے لوگ جھیل کی طرف دوڑنے لگے۔ آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ انتظامیہ بالکل ناکام ہوگئی ہے — '' حکومت چوپٹ ہے چوپٹ، کاٹ دیا ہوگا کسی ہندو نے کسی مسلم کو۔'' نہیں بھائی سکھ بھی ہندوؤں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے ہیں۔'' بغل سے آواز آئی۔

''رات چند مسلمان بیٹھ کر میٹنگ کر رہے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ خون انہوں نے ہی کیا ہو۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا'' سنتے ہی ایک آدمی نے کہا، ''نہیں بھائی!'' ایسا الیکشن میں جیتنے کے لیے نیتا کیا کرتے ہیں۔'' کسی نے فقرہ کسا۔

''کچھ بھی کہیے دیش میں سبھی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔'' یہاں کسی کی جان

کی کوئی قیمت نہیں ہے۔'' کئی لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔

''ہمارے ملک کے پڑوسی دشمنوں کی یہ چال ہے۔'' ایک نیتا نما آدمی بول رہا تھا۔ آخر یہ، سی، آئی، ڈی، اور سی، بی آئی والے کہاں مر گئے ہیں۔ یہاں کی پولس کیا کرتی ہے۔''

''ارے دیکھتے کیا ہو تم بھی کاٹ ڈالو دس پانچ کو'' پُل کے بغل میں ایک جٹے دار سادھو اپنے چیلوں سے کہہ رہا تھا۔

بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی، شہر کے کونے کونے میں ہنگامہ ہو گیا۔ سائیکل، موٹر سائیکل، پیدل، جیپ سے کار سے، بوڑھے جوان سبھی جھیل کی طرف چل پڑے تھے۔

''اگر یوں ہی خون ہوتا رہا تو ہماری ملّت کے لوگوں کا کیا ہوگا، اب ہمیں بھی جہاد کے لیے تیار ہونا ہوگا۔'' ایک سفید داڑھی والے بزرگ سیاسی رہنما مسلم نوجوانوں کی طرف مخاطب ہو کر انہیں جذباتی بنا رہے تھے۔

''اَما ہم پنجابی (سکھ) کاہے کو ڈرے گا، ہمارا گرو نہیں ڈرا، ہم بھی نہیں ڈرے گا۔ ہم کو تلوار ملا ہے، ہم مقابلہ کرے گا۔'' ایک سکھ کی آواز سینے کو چیر کر حلق میں اٹک رہی تھی۔

''فارورڈ کے لوگ بہت بڑھ گئے ہیں۔ یہ تو بیک وارڈ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔'' دو چار سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''اپوزیشن والوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ تو شانتی بیوستھا چاہتے ہی نہیں۔ کہاں کہاں سے جیت کے چلے آئے ہیں! دھت تیری کی!!'' یقیناً وہ ایک نیتا ہی تھا۔

بھیڑ کو چیرتی ہوئی پولس آگے بڑھی۔ لگ بھگ پچاس کے قریب ہو گی۔ رائفل، مشین گنوں سے لیس، داروغہ، ڈی، ایس، پی، ایس، پی، سبھی پل پر پہنچ کر رک گئے۔ پیلی بتی، لال بتی والی گاڑیاں بھی بھیڑ میں گھس گئی تھیں۔ نیتاؤں کا جمگھٹ، پولس محکمہ، سی، آئی، ڈی، کے لوگ، پریس والے، ایک عجیب سا طوفان ایک عجیب سا ہنگامہ۔''

آخر یہ لاش ہے کس کی؟ کس ذات دھرم سے اس کا تعلق ہے؟ سبھی بے چین ہر آدمی پریشان، چہروں پر ہوائیاں، ہونٹوں پر پپڑیاں، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟

''لاش نکالی جائے'' ایس، پی نے پولس کو حکم دیا۔ ایک درجن پولس والے جھیل میں کود پڑے۔ لاش رسی میں باندھ کر اوپر کھینچ کر لائی گئی۔ لوگوں کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سب ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ گویا سبھی کو زہریلا سانپ سونگھ گیا۔ شک و شبہ نے سبھوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا تھا۔ لیکن لاش دیکھنے کے بعد سب نے سکون محسوس کیا۔ اطمینان کی لہر ان کے چہروں پر دوڑ گئی کیوں کہ یہ لاش ایک لمبے تڑنگے کتے کی تھی جو اوندھے منہ پڑا تھا۔

✪✪✪

رنگ چمن

''عشق کی پُر فریب وادیوں میں زیبا کی تمنا لیے بھٹکنا تمہارا مقدر اور اس کے حسن کی تعریف میں موتیوں کی مالا پرونا ہی تمہاری قسمت ہے۔ اپنی خود پسندی پر اترانے کے سوا تمہیں چاہیے ہی کیا؟ کبھی کبھی محبت کی محدود دنیا سے نکل کر زندگی کے دیگر زاویوں پر بھی نگاہ ڈالو تو سمجھ میں آئے کہ تمہاری محبت کی دنیا کے علاوہ بھی درد و الم اداسی و غم، فرحت و مسرت اور سرور و انبساط کی ایک بہت بڑی دنیا آباد ہے۔ اگر تمہارا فلسفۂ محبت زندگی کے کسی کونہ میں فٹ ہوتا تو مجھے تمہارا لکچر سننے میں کوئی گرانی نہیں ہوتی۔ میں بعینہٖ تمہاری محبت کی دیوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔''

میری مانو رحمان! یہ فریب ہے۔ ہاں فریب۔ بس یوں کہ ریت پر بنائی دلکش اور حسین تصویر — جس کی بربادی کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا یا بارش کی چند بوندیں ہی کافی ہیں۔ پیار محبت بچوں کا کھیل ہے۔ ایک حسین دھوکا ہے۔ یہ ڈائلاگ ہے ڈرامہ کا۔ یہ سنیما کے پردے پر دکھائی جانے والی فلموں میں ہی زیب دینے والا ہے۔ محبت

نیند کی آغوش میں حسین خواب ہے۔ یہ جائیداد ہے شاعروں کی یہ میراث ہے ادیبوں کی۔ یہ فنکار محبت کی قلمی دنیا آباد کرتے ہیں۔ خود ان کی اپنی زندگی اس سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ یہ محبت کی خیالی دنیا آباد کر کے جوانوں کے دلوں میں جوش و جذبات اور بوڑھوں کے دلوں میں ''رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے'' کی بات کر کے اپنی شہرت کی چاندی کاٹتے ہیں۔ اور تم ہو رحمان کہ اسے حقیقت کا جامہ سمجھ کر زیب تن کر بیٹھے۔ اتار دو یہ جامہ اور پھینک دو!...... چاک کر دو!!

''بند کرو اپنا بھاشن اب بہت ہوگیا۔''

رحمن کی محبت کی دیوی اکھڑ گئی۔ جیسے میں نے اس کے جذبات پر ہتھوڑا مار دیا ہو— ''تم کیا جانو کہ محبت کیا ہے۔ اس کی مٹھاس تمہاری تقدیر میں کہاں! محبت معیار زندگی اور حیات جاودانی کا انمول رتن ہے۔

''ہاں! ہاں! مبارک ہو تجھے!'' میری تیکھی آواز اس کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ گئی۔ وہ جذباتی ہونے لگا۔

''ارے تمہاری قسمت تو کب کی پھوٹ گئی۔ تمہارے باپ نے بے چینی ہی میں تجھے چھوڑ کر دم توڑ دیا۔ یتیمی کی زندگی تیرا مقدر بنی۔ باقی کتابوں کے بوجھ نے تجھے بونا کر دیا۔ زندگی کے تھپیڑوں نے مار مار کر تجھے کمزور کر دیا۔ ابھی کمر سیدھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنوں نے تجھے لوٹ لیا۔ مصیبت تیرا مقدر اور تکلیف تیری قسمت رہی۔ اب بھلا محبت کا فلسفہ تجھ جیسے کتابی کیڑے کی سمجھ میں آنے کا ہے کیا؟ مشکلات میں پلا انسان محبت کو کیا جانے۔ اب تک جس نے تکلیف کے عتاب میں آرام کا باب نہ الٹا ہو بھلا وہ بھی اس کا معنی سمجھ سکتا ہے!''

''اگر آئندہ کبھی تم نے میرے خیالات کو گالی دی تو میں تمہاری دھجیاں اڑا دوں گا۔''

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میری زیبا کیا ہے۔ پتھروں کی طرح ٹھوکر کھا کھا کر

تمہارا دل بھی تو پتھر ہو چکا ہے۔ تم پر بھلا موج مستی کی باتیں کیسے اثر کرے گی۔ تمہارے دل میں درد کی داستاں کی جگہ ہے محبت کی دنیا نہیں۔ تمہاری زندگی میں کوئی طوفانِ محبت آیا ہوتا تو تم میری زیبا کے بارے میں کان لگا کر سنتے۔ لعنت ہے تمہاری خشک زندگی پر۔ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں کہ تمہاری دنیا بھی محبت بھری دنیا ہو تا کہ تم میرے خیالات کی قدر کرو اور میرے جذبات کو تسلیم۔"

"میری زیبا حسن کی ایک دنیا ہے۔ حسن کی پریاں اس کے قدموں کی دھول ہیں۔ اگر اس کے حسن کو گلاب کی پنکھڑی دیکھ لے تو پانی پانی ہو جائے۔ خوبصورت پھولوں کو شرم آجائے جب ان کی نگاہیں زیبا کے رخسار پر پڑجائیں۔ اگر اس کی آنکھوں پر نرگس کی نظر پڑجائے تو ڈال سے ٹوٹ کر گر جائے۔ زلفیں جب ناگن کی طرح بل کھاتی ہیں تو کالی گھٹائیں اپنی راہ بدل دیتی ہیں۔ حسن میں شوخی ہے اور شوخی میں دیوانگی کا جادو ہے۔"

"میں تجھے کیا بتاؤں۔ مجھے اپنے باپ پر غصہ آتا ہے۔ میرے باپ نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ اگر میرے باپ نے میرے لیے کافی دولت چھوڑی ہوتی تو میں شاہ جہاں کی محبت کی یادگار "تاج محل" سے بھی خوبصورت محل "زیبا محل" تعمیر کرواتا۔۔۔ جسے دیکھ کر مستقبل کا مورخ مجھے شہنشاہِ محبت لکھتا اور میری زیبا کا حسن دنیا والوں کے سامنے لافانی حسن بن جاتا۔ دنیا اس کے حسن کا افسانہ پڑھتی۔ لیکن نہیں میرے باپ نے...... جب بھی میں سوچتا ہوں دل بوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک بھاری بوجھ کے احساس سے دل برداشتہ ہو جاتا ہوں۔ کاش کہ کالی دولت......"

جب میری سماعت پر ہتھوڑے برسنے لگے تو میرا پارہ چڑھنے لگا۔ میں اس طرح کی باتوں پر کب چپ رہنے والا تھا۔

"رحمٰن ہمارے قوم کے تنزل کی یہی وجہ ہے کہ ہم عشق و محبت کی حسین داستان دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے ملک و قوم کی دولت بے دریغ لٹا دیتے

ہیں۔ محبت کی یادگار اور اپنی ناموری کے لیے دولت کو پانی کی طرح بہادیتے ہیں۔''

''رحمٰن کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ تمہارا ''زیبا محل'' بھی اسی ''تاج محل'' کی طرح ہوگا جس میں نہ جانے کتنے خون پسینوں سے کمائی ہوئی دولت صرف ہوگی۔ کتنی جان فشانیوں سے بنے ہوئے محل کا صرف اور صرف ایک مقصد ہوگا محبت — تمہاری محبت کی یاد — محبت کا محل — اس کے لیے لاکھوں دولت اہل ہنر کی نذر کردینے، کتنی جدوجہد سے خوبصورت سنگ مرمر اور اس کے لوازمات مہیا کرنے میں ایک طویل مدت صرف کردینے سے ہندوستان کو کیا ملے گا۔ آنے والی نسلوں کا مستقبل اس سے کس طور پر جڑے گا؟ مستقبل میں ملک وقوم کا اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ ایسے محل کا تصور ہندوستان کی تہذیب کی توہین ہے۔ اس کا مستقبل آنے والی نسلوں کے لیے صرف ایک محبت کی داستان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ شاید مستقبل کا نوجوان تمہارے اس محل کو دیکھ کر اپنی زندگی میں بھی محبت کا محل بناڈالے۔ لاکھوں کی دولت اپنی آنکھیں بند کر کے اس میں خرچ کردے — اور ہر سال اسی طرح ایک ایک محل تعمیر ہوتا رہے تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری تہذیب کا مورخ داستان محبت کی تاریخ ہماری زندگی سے جڑا دیکھ کر محبت کے محلات کی تہذیب کی تاریخ لکھ ڈالے۔''

''سوچو رحمٰن! ذرا اپنے خیالات کو وسعت دو۔ دنیا چاند پر چلی گئی۔ آسمان پر کمندیں پھینکی جارہی ہیں۔ سیاروں کی چالیں پہچانی جارہی ہیں۔ ہواؤں کی خوشبو سے بارش کے رنگ کا اندازہ لگایا جارہا ہے۔ انسان نے مشینوں کا آدمی بنا کر اشاروں پر کام لینا شروع کردیا ہے۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے کھل رہے ہیں۔ تجرباتی اداروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ نئی نئی یونیورسٹیاں کھول کر مستقبل کو تابناک بنانے کی فکریں کی جارہی ہیں۔ اور ایک تم ہو جو شاہ جہاں کی پیروی میں ''زیبا محل'' کی تعمیر کے لیے اپنے باپ کو کوس رہے ہو۔ ایک فانی حسن کے پیچھے ماضی کا دکھ اور مستقبل کا عتاب لانے کی فکر کررہے ہو — آج اپنا مزاج بدلو اور زندگی کے دوڑتے ہوئے میدان میں خود ایک

لافانی یادگار بن جاؤ— ایک مثالی شخصیت بنو۔ تاکہ آنے والی نسلیں تم پر ناز کریں۔ میں فخر کروں۔ تمہارے اپنے بیگانے سب تمہاری تعریف کریں۔"

میری ان باتوں کا رحمٰن پر کچھ اثر بھی ہوا یا نہیں۔ شاید ساری باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی ہوں۔ اس کے مزاج میں رنگینیاں تھیں۔ ان سب باتوں کو وہ سننے کے لیے تیار ہی کب تھا— سگریٹ کا مرغولہ فضا میں اڑاتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا— "ارے یار! آؤ میں تجھے زیبا کی ایسی دلچسپ کہانی سناتا ہوں کہ تم اچھل پڑو گے۔ اس کی زیبا کی کہانی سننے سے انکار میں جھگڑے کا اندیشہ نظر آیا۔ میری رضامندی دیکھ کر رحمٰن رومانی کہانی میں کھو گیا۔

"کتنا پیارا تھا وہ وقت جب میں زیبا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیار و محبت کی باتیں کر رہا تھا۔ دنیا میں میرے لیے صرف ایک ہی چیز خوبصورت تھی اور وہ تھی میری زیبا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کی چند سہیلیاں آ گئیں۔ انہوں نے اشاروں میں کچھ باتیں بھی کیں۔ اسی اثنا میں ایک گلابی رنگ بھرا پیالہ زیبا نے میرے سر پر انڈیل دیا۔ میرا چہرہ رنگوں میں ڈوب گیا۔ میں شرما گیا۔ وہ اپنی سہیلوں کے ساتھ اپنی فتح پر قہقہے لگانے لگی۔ جیسے اس نے بہت بڑی بازی جیت لی ہو۔ میرے اندر بیٹھے بیٹھے لذت کا احساس ہونے لگا۔ جب میں نے اپنا چہرہ صاف کرنے کے لیے رومال مانگا تو اس نے اپنا ریشمی دوپٹہ بڑھا دیا۔ میں نے دوپٹہ سے کچھ عجیب سی راحت محسوس کرتے ہوئے چہرہ کا رنگ اس میں اتار دیا— جب میں رنگ پونچھ رہا تھا تو میری نگاہ اس کے چہرہ پر ٹکی تھی اور اس کا دوپٹہ میرے ہونٹ پر— میں نے دیکھا کہ اس کے چہرہ پر ایک پرکشش رنگ ابھر آیا تھا— رنگِ شباب اور شرم و حجاب کا ملا جلا رنگ۔ پیار میں اقرار اور انکار کا رنگ— لاج اور لطف کا سنگم— بہار کی لذت اور خزاں کا اضطراب— رنگِ شفق اور سکوت شب کا قرار— میں پیار کی مستیوں میں ڈوبتا چلا گیا— اس کے بعد ہم اکثر پارک میں ملتے اور پیار و محبت کی باتیں کرتے ہیں۔"

دن بیتتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک منحوس دن بھی آگیا۔ کتنی اداس اور کتنی منحوس تھی وہ گھڑی جب رحمٰن اپنی فیکٹری میں مشین کی زد میں آکر بیہوش ہوگیا— جب اسے اسپتال میں ہوش آیا تو اسے پتہ چلا کہ ڈاکٹر نے اس کا ایک ہاتھ کاٹ کر جسم سے جدا کردیا ہے۔ اس نے زوردار چیخ ماری— پر جو ہونا تھا ہوگیا— اداس شاموں بے چین راتوں اور سوگوار لمحوں نے تین مہینوں تک اسے ہاسپٹل میں گھیرے رکھا۔ ایک دن ڈاکٹر نے اسے رخصت نامہ تھما دیا— وہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو چادر سے ڈھکے گھر آگیا۔

تین مہینے بستر مرض پر پڑے رہنے کے درمیان ایک بار زیبا نے عیادتاً اسے دیکھا تو اسے حقیقت حال کا پتہ ہوگیا۔ پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔ جب رحمٰن قدرے سکون محسوس کرنے لگا تو زیبا کی یاد محبت نے ماضی کی یادوں کو پھر تازہ کردیا۔ اس کی یاد آنے لگی تو رحمٰن اسی پارک کی طرف چل پڑا۔ جہاں اس نے اپنی رنگیں شامیں بتائی تھیں۔ پارک میں شام کے سرمئی رنگ اور ان رنگوں کے بیچ موسیقی کی مدھر تان پر تھرکتے لچکتے کمر اور کمر پر جنس مخالف کا ہاتھ پھر اس ماحول میں دھیمے سروں میں نغموں کی آواز اور ان نغموں کے بیچ زیبا کی تلاش۔ اچانک رحمٰن کی نظر زیبا سے جاٹکرائی— اس نے ایک ہی جھٹکے میں چادر کو کاندھے سے دور پھینک دیا اور شدّت جذبات سے مغلوب ہوکر ایک ہی ہاتھ سے اسے سینے سے بھینچنے کی کوشش کی کہ اسی بیچ ہوا میں لہراتا ہوا زیبا کا زوردار طمانچہ چٹاخ...... چٹاخ...... کی آوازیں کرتا رحمٰن کے گال کو لال کرگیا— اس کی آنکھوں کے سامنے لال لال، نیلی نیلی، پیلی پیلی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ زیبا محل ٹوٹ کر فضاؤں میں بکھرتا نظر آنے لگا۔ زمین ہلتی اور آسمان کانپتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے جسم میں زلزلہ آگیا— وہ بھاگنے لگا نہ جانے وہ کس منزل کی طرف جارہا تھا۔

✪✪✪

زندہ لاش

زندگی کو خیال و فکر کے حصار میں سماجی حالات اور کشمکش کے سائے میں تلخ حقائق کا سامنا کرنے کی سکت برقرار رکھنی پڑتی ہے۔ شہرِ نامراد میں زندگی کا بوجھ گردشِ حالات کے تھپیڑوں کے درمیان بھی ڈھونا پڑتا ہے۔

یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہاں کی ہر چیز موت کی امانت ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اس دارالفنا میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کی بھی آمد ہوتی ہے جو اپنے غلط کارناموں، بری حرکتوں، تخریبی سازشوں کی وجہ کر چرچے کا موضوع بن جاتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ سازش کی سڑی گلی لاش بن کر سماج میں تعفن پھیلاتے پھرتے ہیں۔

انسانی ہلاکتوں کا جو منظر آج کل نئے نئے زاویوں میں ابھر کر ہمارے سامنے آرہا ہے اُسے دیکھ کر پڑھ کر یا سُن کر دل دہل جاتا ہے۔ انسانی بے حسی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ظلم و ستم قتل و غارت گری کے مناظر آئے دن دیکھنے کے بعد بھی احتیاطی

تدابیر فیل ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اللہ کی اس بنائی ہوئی زمین پر نہ جانے کتنی ہلاکتیں ہورہی ہیں۔ یا پھر یوں کہئے کہ ہلاکتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ ایک خود ساختہ ہلاکتیں ہیں جو انسانوں کی اپنی کمائی ہوتی ہیں اور دوسری قدرتی آفات کی شکل میں انسانی ہلاکتوں کا ہولناک منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ قدرت کا نظام بھی عجب ہے۔ ظہور پذیر انکشافات کو دیکھ کر دنیا محو حیرت ہوجاتی ہے۔ خودغرضی، ذاتی عناد، اور آپسی رنجش بھی کیا کیا رنگ دکھاتی جاتی ہے۔

راجندر کی خاندانی رنجش انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلہ میں انگارہ بن گئی تھی۔ جب کبھی اُس کے دشمن کا چہرہ سامنے نظر آجاتا تو اُس کا دل جل جاتا اور اس بھڑکتے ہوئے شعلہ میں خاندانی جھگڑے کی وجوہات کی تصویر ابھر کر سامنے آجاتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اُس کی حیات کا خاتمہ کردے لیکن قانون اور انتظامیہ کی گرفت کے ڈر سے اُس کے ہاتھ اُس کی گردن تک نہیں پہنچ پاتے۔

وہ دن کے اجالے اور رات کی تاریکی میں دشمن کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے سازش کے تانے بانے بُنتا تھا۔ کبھی سوچتا کہ اُس کو قتل کردے..... کبھی سوچتا نہیں..... ایسا کرنے سے وہ جیل چلا جائے گا۔ پھر کبھی اُس کے دل میں خیال آتا کہ رات کے اندھیرے میں اُس کے مکان کو نذر آتش کردے۔ نہیں ایسا کرنے سے دوسرے پڑوسیوں کے جل جانے کا خطرہ ہے۔ معاً اُس کے دل نے اس کو ٹوکا۔ کبھی سوچتا دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اعتماد میں لے کر اُس کی ضیافت کرے اور کھانے میں زہر دے کر اُس کو مار ڈالے۔ پھر سوچنے لگتا ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر بات کھل گئی تو گاؤں اور علاقہ میں رسوائی ہوگی۔ نہیں..... نہیں..... وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ اُس کا دل انجانے خوف سے کانپ جاتا۔ کبھی سوچتا ایک نہ ایک دن اوپر والے موت کا فرشتہ بھیج کر اُسے بلا ہی لیں گے۔ جب وہ فطری موت مرجائے گا تو ہماری خاندانی رنجش کا خاتمہ خود بہ خود ہوجائے گا۔ نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا۔ تب کیا ہوگا ہماری خاندانی

عداوت کا— انتقام کی دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر جب تک دشمن کے وجود کو خاکستر نہیں کردے گی مجھے سکون کہاں—؟

موت زندگی پر ہونے والا وہ حملہ ہے جس کی زد میں ہر جاندار کو آنا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ گو کسی بھی منحوس خبر کو سُن کر افسردہ ہو جانا انسانی فطرت ہے لیکن موت دہشت ہے جو بڑے سے بڑے بہادروں، راجوں، مہاراجوں، سورماؤں کو پلک جھپکتے چت کردیتی ہے۔ موت کی خبر سنتے ہی پتھر دل انسان بھی سہم اٹھتا ہے— پھر آدمی...... اس سماج کا آدمی انتقام کے احساس کی شدت میں کیوں کسی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ پھر وہ آدمی کتنا غمگین ہوتا ہے جس کا اپنا رشتہ دار اِس دنیا سے جا چکا ہوتا ہے اور یہ احساس اپنی انتہا کو اس وقت پہنچ جاتا ہے جب کسی قریبی رشتہ دار باپ، بیٹا، دوست، ساتھی، بھائی یا پڑوسی کی موت خلاف توقع کم عمری یا جوانی میں ہو اُداسی اُس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ایک ایسے فرد کی موت کی خبر ملتی ہے جو اپنے کنبے کے اخراجات کی گاڑی تنہا کھینچنے والا ہوتا ہے۔ اُس کے پسماندگان کی آہیں، کراہیں دیر تک...... بہت دیر تک احساسات کی المناک تصویر بن کر حالات کے اردگرد ابھرتی رہتی ہیں۔

ایسے فرد سے ایک انجانی اُنسیت اور اپنائیت کا احساس ہر کس و ناکس کو ازخود ہونے لگتا ہے۔ اگر ہمارے اردگرد کا کوئی نوجوان کم عمری میں اپنی بساط حیات سمیٹ کر کائنات کی پہناؤں میں گم ہو جاتا ہے تو دیر تک اُس کی درد بھری یادٹیس بن کر ابھرتی رہتی ہے۔

راجندر کو اپنے گاؤں کے باشندہ پریم کمار سے زمین جائداد کو لے کر خاندانی دشمنی چلی آرہی تھی۔ وہ دن رات پریم کو پھنسانے کے لیے طرح طرح کی سازش کرتا رہتا۔ وہ کئی سالوں سے موقع کی تلاش میں تھا۔ ادھر پچھلے چند دنوں سے جسمانی کسل مندی کے ساتھ ساتھ کچھ ذہنی تھکاوٹ بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے اُس نے سوچا کہ

ندی کے کنارے گھوم کر ذہنی سکون حاصل کرے۔

شام کا وقت تھا۔ شاہ خاور اپنی سنہری پلکیں جھپکا کر مغرب کی گود میں چھپ جانے کو بے تاب تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ڈوبتا سورج مادر گیتی سے پوچھ رہا ہو کہ موت اور زندگی کی حقیقت کیا ہے......؟

شام کے دل کش منظر میں سورج کی موت و حیات کی کشمکش سے بے نیاز راجندر اپنے خیالات میں گم ندی کے کنارے بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن پر تفکرات کا بوجھ لیے پھر رہا تھا۔ اچانک اُس کی نگاہ ندی میں بہتی ہوئی ایک مسخ شدہ لاش پر پڑی۔ اُس نے سوچا ایسے غنیمت موقع کو وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ وہ ندی میں کود گیا اور لاش کو پکڑ کر کنارے لے آیا۔ اُس نے سوچا پریم کو فلمی انداز میں اِس نامعلوم شخص کی لاش کے حوالہ سے، قتل کے جھوٹے مقدمہ میں پھنسا کر جیل کی ہوا کھلانے کی سازش میں وہ کامیاب ہو جائے گا۔

رات کی تاریکی میں لاش ندی سے اٹھا کر وہ اپنے گھر لے آیا۔ اپنے ۲۵ سالہ نوجوان بیٹے وجے کو بلایا۔ راز و نیاز کی تمام باتیں بیٹے کو سمجھاتے ہوئے رات کی تاریکی میں گاؤں چھوڑ کر فرار ہو جانے کی صلاح دی۔ بٹیا کو سمجھا دیا کہ بہت دنوں تک گاؤں نہیں لوٹنا ورنہ راز کھل جائے گا۔ اس لاش کو میں تمہاری لاش بتا کر پریم پر قتل کا مقدمہ دائر کروں گا اور اسے جیل کی ہوا کھانے کے لیے بھجوا دوں گا۔ تب پتہ چلے گا پریم کو کہ اُسے بھی کسی استاد سے پالا پڑا ہے۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

وجے باپ کی سازش کو سمجھتے ہوئے رات کی تاریکی میں گھر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

صبح ہوتے ہی راجندر نے رونا، چلّانا، کپڑا پھاڑنا، بال نوچنا شروع کر دیا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا، میرے نوجوان بیٹے کی ہتیا پریم نے کر دی۔ ہائے میرا بیٹا وجے تو کہاں چلا گیا۔ پریم میں تجھے دیکھ لوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو نے میرے بیٹے کی ہتیا کر دی۔ تو میرا دشمن ہے پریم...... تو میرے بیٹے کا قاتل ہے۔

اُس کی آواز روتے روتے رُندھ گئی۔ دیکھتے دیکھتے گاؤں علاقہ میں قتل کی واردات کی خبر پھیل گئی۔ آپس میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ پریم پر قتل کا مقدمہ دائر ہوا۔ دفعہ 302 کے تحت پریم کو پولس گرفتار کر کے لے گئی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے پولس اٹھا کر لے گئی۔ راجندر نے اس لاش کو اپنے بیٹے کی لاش بتا کر پوسٹ مارٹم کروا دیا۔ گھر لا کر داہ سنسکار یعنی آخری رسم بھی ادا کردی۔ نام نہاد مقتول کی بیوہ نے ہاتھ کی چوڑیاں توڑ لیں۔ مانگ کا سندور مٹا ڈالا۔ اُس کی ماں کوکھ اجڑنے کے غم میں رو رو کر پاگل سی ہوگئی تھی۔ راجندر مقدمہ میں پھنسا کر پریم کو جیل بھجوانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے فلمی انداز میں یہ کام کر کے لوگوں کو بھونچکا کر دیا تھا۔

راجندر کی خوشیوں کے سنہرے دن تیزی سے گزرتے گئے۔ تین سال بعد اُس کو اپنے بیٹے کے گھر سے غائب رہنے کی کمی محسوس ہونے لگی۔ باپ کا دل اپنے بیٹے کے دیدار کے لیے گاہے گاہے تڑپ اٹھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا بے کار میں نے اس طرح کا ڈرامہ رچا۔ میں نے انتقام کی خاطر اپنے ہی آنگن کو سونا کرلیا۔ کبھی کبھی اداسیوں کی دبیز چادر اُس کے اوپر تن جاتی تھی۔ اُس کی بہو شوہر کی لمبی جدائی کا غم سہتے سہتے عاجز آچکی تھی۔ بہو کی گود اب تک سونی تھی۔ راجندر اپنی بہو کے طنز کے تیر کا نشانہ بننے لگا تھا۔ بہو کی کوس۔۔۔ بیوی کی اداسی۔۔۔ آنگن کا سونا پن۔۔۔ بیٹے کے زندہ رہتے ہوئے بھی ایک زندہ لاش کا ڈرامہ، کبھی کبھی راجندر کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا تھا۔ لیکن! خود کردہ را علاجے نیست۔۔۔

اپنے پھیلائے ہوئے جال میں وہ الجھ چکا تھا۔ وقت کے چنگل میں وہ اتنی بری طرح پھنس چکا تھا کہ اس مسئلہ کا حل اُسے دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جب کوئی پاپا...... پاپا...... کہہ کر پکارتا تو اُس کو اپنا وجود ہلتا ہوا نظر آتا تھا۔ کتنے خواب دیکھے تھے اس نے۔ محبت کے گلشن میں امیدوں کے سجائے ہوئے پھول اب مرجھانے لگے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ اوقات کے دھاگے لمحات کے ہاتھوں ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔ وجئے کا دل بھی اداس اداس رہنے لگا۔ ماں، باپ، بیوی، یار، دوست، گھر آنگن کی یاد ستانے لگی۔ اُس نے گھر والوں سے ملنے کے لیے دل میں ٹھان لی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

رات طوفانی تھی۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اندھیری رات نے ماحول میں خاموشی کی چادر تان رکھی تھی۔ رہ رہ کر بجلی کڑک کڑک جاتی تھی۔ رات کے سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ رات کے سناٹے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آدھی رات کو چھپتے چھپاتے گلیوں سے گزرتا ہوا وجئے اپنے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو اُسے سب کے چہروں پر عجیب سی اُداسی، گھبراہٹ، افراتفری اور خوف کی سی پرچھائیاں منڈلاتی محسوس ہوئیں۔ وہ ماں باپ سے چمٹ گیا۔ کئی سالوں کے بچھڑے ہوئے ایک ساتھ مل کر دیر رات تک باتیں کرتے رہے۔ اُسے محسوس ہوا کہ ماں کی دھڑکنوں میں بھی خوف شامل ہے۔ اُسے اپنے ہی گھر میں خوف کا احساس ہونے لگا۔ رات گزرتی رہی۔ صبح ہونے سے پہلے اندھیرے منہ گھر چھوڑ کر چھپتے چھپاتے گاؤں سے نکل گیا۔ ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی کے انتظار میں ڈبکی لگائے ہوئے بیٹھے وجئے کو گاؤں کا ہی جن پر مقدمہ تھا، اُن کے خاندان ہی میں سے ایک نے دیکھ لیا۔ ارے وجئے تم......! تم زندہ ہو......! نہیں...... تم تو مر گئے تھے...... آخر تم زندہ کیسے ہو ...... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا...... تمہارا تو داہ سنسکار ہو چکا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ گھبراہٹ میں اُس نے وجئے کو دھر دبوچا۔ یک ہنگامہ بپا ہوا۔ مسافروں کی بھیڑ اکٹھا ہونے لگی۔ پولس آ گئی۔ گاؤں والے نے ماضی کی داستان پولس کو بتائی۔ وجئے کو گرفتار کر کے پولس گاؤں لے گئی۔ گاؤں والوں نے وجئے کی پہچان کر لی۔ باپ نے بیٹے کے زندہ ہونے کی زندہ حقیقت قبول کی۔ واردات کی تحقیقات کے بعد بے قصور پریم کمار کو جیل سے رہائی مل گئی۔ تفتیش کے بعد

پولس نے باپ بیٹے دونوں کو قتل کے الزام میں تعزیرات ہند کے دفعہ 302 کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

دبیز پردوں میں حقیقت کو تھوڑے عرصہ تک ہی چھپایا جا سکتا ہے۔ اب راجندر کا پورا گھر سنسان اور اندھیرا تھا۔ سائیں سائیں کرتی خاموشی اُس کے جسم کو چھو کر گزر گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی زندگی زمین پر ایک بوجھ ہے۔ وہ کانٹوں کے جال میں گھر گیا ہے۔ اب اُس کا وجود جیسے ایک زندہ لاش ہے۔

✪✪✪

احساس

آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ گرمی کی شدّت سے لوگ ابل رہے ہیں۔ ماحول میں تپش ہے۔ لوگ اِس قدر پریشان ہیں کہ سایہ بھی تلاش کرنا شدّت احساس کے دھاگوں میں ماحول کی حدّت کو باندھنے کے مترادف ہے۔ بچے جوان بوڑھے گرمی سے تپ رہے ہیں۔ جون کا مہینہ سخت گرمی کے لیے مشہور ہے۔ لیکن اِس بار جو گرمی کی شدّت ہے اِس نے کئی برسوں کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ سائنس داں حیران ہیں، لوگ پریشان ہیں اور اِسی موسم میں بجلی کا بحران ہے — بجلی کی آنکھ مچولی نے پنکھے، کولر، فریجر، ایئر کنڈیشن، سب کی کنڈیشن بگاڑ دی ہے۔ جہاں دو چار پڑھے لکھے لوگ جمع ہو جاتے ہیں تو یہی بحث چھڑ جاتی ہے — کہیں گرمی کی یہ شدّت بم دھماکوں کی تاب کاری کے سبب تو نہیں ہے؟ کہیں جنگل اور ہرے درختوں کی کٹائی کے سبب تو ایسا نہیں ہے؟ کہیں کل کارخانوں کی آلودہ ہوا کے سبب تو ایسا نہیں ہے؟ سائنس دانوں نے خبردار کیا ہے کہ ۲۰۵۰ تک زمین کی سطح کا اوسط درجہ حرارت دو ڈگری بڑھ

جائے گا۔ دن پر دن فضا اور آلودہ ہوتی جا رہی ہے کہیں گرمی کی اصل وجہ یہی تو نہیں ہے۔ گویا جتنے منھ اتنی باتیں۔

کیا ہوگا جب اور تپے گی دھرتی۔ سخت گرمی اور لو کا قہر بدستور جاری ہے۔ لو اور گرمی کی وجہ سے گذشتہ کئی دنوں سے زندگی مفلوج ہے۔ اب اِس حالت سے لوگوں کو کوفت ہونے لگی ہے۔ گرمی اور لو کی وجہ کر لوگوں کے مرنے اور بیمار ہونے کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ بدن کو جھلسا دینے والی اور حلق تک کو سوکھا دینے والی اِس بھیانک گرمی سے کب نجات ملے گی، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بارش کی بے رخی نے اِس موسم میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ دس بجے دن سے ہی کرفیو کا عالم بنا رہتا ہے سڑکوں پر۔

لیکن اِن تمام حالات سے بے نیاز ہو کر بوڑھا فضلو میاں نابینا اپنی بوڑھی بیوی کے سہارے سر پر ٹوکری لادے روزانہ گاؤں سے شہر جاتا ہے۔ گاؤں سے شہر دس کیلو میٹر دور ہے۔ پھٹے کپڑے اور آنکھوں کی روشنی سے محروم بوڑھا فضلو میاں بازار سے پھل خرید کر گاؤں میں پھیری لگا کر اپنی بیوی کی بینائی کے سہارے بیچتا ہے۔ اُس کی بیوی اپنے سر پر ایک ٹوکری رکھتی ہے اور دوسری ٹوکری فضلو میاں اپنے سر پر رکھتا ہے۔ لاٹھی کا ایک سرا فضلو میاں اور اگلا سرا اس کی بیوی تھامے ہوئے آگے آگے چلتی ہے اور اسی طرح دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر معمول کے مطابق وہ روزانہ یہی عمل دہراتے دیکھے جاتے ہیں۔

موٹی عینک لگائے بوڑھیا اپنے نابینا شوہر سے راستہ میں چلتے چلتے تھک جانے پر جب ذرا ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے تو پھلوں سے لدی ٹوکری کو ایک دوسرے کے سر سے اتارنا بڑی مشکل ہوتی ہے۔ شہر کے بازار سے وہ پھل خریدتے ہیں اور سستا مہنگا ادھار نقد گاؤں میں پھیری لگا کر بیچتے ہیں اور اپنی زندگی تین عدد بچوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ فضلو میاں کے تینوں بچے ابھی نابالغ ہیں جو جوان ہو کر ماں باپ کا سہارا بنیں گے۔

ایک دن دیکھتے دیکھتے میرے دل میں یہ بات کھٹکی کہ میں کیوں نہ فضلو میاں کا درد ٹٹولوں — میاں تم اس عمر میں اتنی محنت کیوں کرتے ہو اور ساتھ میں اپنی بوڑھی بیوی کو بھی پریشان کرتے ہو۔ تم تو اندھے اور بوڑھے ہو۔ سڑک پر جھولی پھیلا کر یا کسی مسجد کے دروازہ پر ہاتھ پھیلا کر پیسے مانگ کر بیوی بچوں کی پرورش کر سکتے ہو کیوں گرمی کی شدت میں موت کے منہ میں جانے کے لے سڑک ناپتے ہو۔ کسی گاڑی نے اگر ٹھوکر ماردی تو سنبھلنے بھی نہ پاؤں گے کہ تم دونوں ڈھیر ہو جاؤ گے۔ بہتر ہے کہ کسی کونے میں بیٹھ جاؤ اور اللہ کے نام پر کچھ دے دو بھائی کی رٹ لگاؤ۔ لوگ بڑے فیاض ہیں پیسوں سے تیری جھولی بھر دیں گے۔

''تو گویا بابو تم بھیک مانگنے کی بات کر رہے ہو۔''

''نہیں میاں میں بھیک نہیں مدد مانگنے کی رائے دے رہا ہوں۔''

فضلو میاں کے سوالیہ جملے کو کاٹتے ہوئے میں نے کہا۔

''بھیک اور مدد میں کیا فرق ہوتا ہے بابو جی؟''

''بھیک بے سہارا غریب اور معذور افراد کو دی جاتی ہے اور مدد امیر اور غریب سب کی کی جاتی ہے۔''

میں نے سمجھانے کے انداز میں اُس کو کہا۔

''تو گویا تم الٹی سیدھی رائے دے کر مجھ سے بھیک منگوانا چاہتے ہو۔ میں بھوک سے مر جاؤں گا لیکن بھیک نہیں مانگوں گا۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں بھیک کا دانہ میرے لیے جائز نہیں ہے۔''

فضلو میاں کی خوددارانہ گفتگو نے میرا سر جھکا دیا۔ میری زبان بند کردی۔ میں کچھ دیر کے لیے سکتہ میں پڑ گیا۔ یہ عمر، یہ حالت، یہ صحت، اور یہ خودداری۔ واہ کیا بات ہے ایسے لوگ بھی اس دنیا میں زندہ ہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں چلتی پھرتی مخلوق میں کیسے کیسے دل و دماغ والے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کل وہ کیسا منظر تھا جسے میری آنکھوں نے دیکھا۔ چار ہٹھے کٹھے نوجوان ایک چادر کے چاروں کونے کو پکڑے ہوئے روڈ کے کنارے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ پیچھے ایک رکشہ پر لاؤڈ اسپیکر سے کچھ خاص قسم کی آواز نکل رہی تھی جو سننے والوں کو متوجہ کرتی۔ راستہ چلنے والے ایک روپیہ دو روپیہ چادر میں ڈال دیتے اور چلتے رہتے۔ کچھ سن کر اَن سُنی اور کچھ دیکھ کر اَن دیکھی کرتے جاتے۔ میں نے بھیک مانگنے والا سمجھ کر دو چند سکّے اُن کی چادر کی طرف اچھال دیے۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہو؟'' میرا دوست جو میرے ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے مجھے ٹوکا۔ کیوں محنت کی کمائی کو پانی میں پھینک رہے ہو۔

''ارے میں پھینک نہیں رہا ہوں میں تو ان مفلسوں کو بھیک دے رہا ہوں، جو چادر پھیلائے آس لگائے روڈ پر گھوم رہے ہیں۔''

واہ بڑے، فیّاض نکلے۔ میرا دوست مجھ پر اندر اندر ناراض ہوکر اُبل پڑا۔ تم جانتے نہیں ہو یہ نئے زمانے کے نئے بھیک منگے ہیں۔ ارے یہ ماڈرن بھیک مانگے ہیں ماڈرن— بھیک مانگنے کا انہوں نے نیا نیا طریقہ نکال لیا ہے۔ یہ ہٹھے کٹھے نوجوان ہیں محنت مزدوری کر کے تو کماتے نہیں ہیں۔ خواہ مخواہ لوگوں کو ٹھگتے ہیں۔ اور تم جیسے لوگ ان بھیک منگوں کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

''چلو چاہے جو بھی ہو، ہیں تو بھیک منگے، میں نے دو چند روپئے ہی دے دیے تو کیا برا کیا۔ ہاں تم کہتے ہو تو آئندہ ایسے لوگوں سے پرہیز کروں گا۔ میں نے اپنے دوست کو سمجھاتے ہوئے اُس کا غصّہ ٹھنڈا کیا۔

پھر میں ان چاروں کا موازنہ فضلومیاں سے کرنے لگا۔ کتنا فرق ہے ان دونوں کی زندگی میں۔ کھاتے تو دونوں ہیں۔ کماتے تو دونوں ہیں۔ لیکن دونوں کی کمائی کے ڈھنگ الگ الگ ہیں۔ ایک کڑی دھوپ میں سر پر بوجھ ڈھو کر پسینہ بہا کر پیسہ کماتا ہے اور دوسرا چادر پھیلا کر......

کہا جاتا ہے کہ مادیت پرستی کا جو رجحان حالیہ دو دہائیوں میں بڑھا ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ اسی مادیت پرستی کی وجہ سے بدعنوانی کی شرح میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ جرائم کی دنیا میں بھی ان کی جڑیں کافی گہرائی میں جا چکی ہیں۔ موجودہ دور میں جہاں انسانی قدروں اور سماجی رشتوں کی مضبوط جڑیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ سماج اور کنبہ میں محبت، ہمدردی اور بھائی چارگی صرف رسم و رواج کی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں وہیں کوئی بھائی ایک دوسرے کو اچھی رائے اور بہتر مشورہ دیتا ہے تو یہ بڑی بات ہے۔ اسی تناظر میں فضلو میاں کو میں نے آسمان سے ہاتھ پھیلا کر روپیہ پیسہ حاصل کرنے کی رائے دی تھی۔ دراصل میں نے اُس کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے ایسا ازراہ ہمدردی کیا تھا لیکن اس نے میری ایک نہ مانی۔ یہ تجویز مسترد کر کے اُس نے اچھا ہی کیا۔ اس نے میری رائے یہ کہہ کر مسترد کر دی تھی کہ ہاتھ پھیلا کر غلط طریقوں سے روپیہ پیسہ کمانے میں وہ یقین نہیں رکھتا۔ چلو اچھا ہوا کہ اس نے انکار کر دیا ورنہ اس کے بھیک منگوانے کا ذمہ دار خواہ مخواہ میں بن جاتا۔ انکار کر کے اس نے مجھے اس کا ذمہ دار ہونے سے تو بچا دیا۔

روز و شب ماہ و سال بن کر گزرتے رہے۔ فضلو میاں اپنے معمول کے مطابق گاؤں اور شہر کی دوڑ لگاتا رہا۔ بڑی محنت کے بعد جو کچھ کمائی ہوئی اُس میں سے کچھ روپے پس انداز کرتا۔ تاکہ اس کی ایک بیٹی جب جوان ہو جائے تو شادی کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔

ایک دن وہ دونوں اِسی طرح شہر گئے ہوئے تھے۔ شہر ہڑتال ہونے کی وجہ کر ان کو رک جانا پڑا۔ کل ہو کر جب دونوں گھر لوٹے تو کلیجہ پیٹ کر رہ گئے۔

چور اُن کی جھونپڑی کا تالا توڑ کر گزر بسر کے سامان سمیت جو کچھ روپے پیسے تھے سب کچھ لے اڑے تھے۔ وہ زار و قطار رونے لگے۔ ان کی برسوں کی کمائی لٹ گئی۔ ان کے بچے آہ و بکا کرنے لگے۔ فضلو میاں زور زور سے چلا رہا تھا۔ میرا سب

کچھ لٹ گیا۔ میری دنیا اجڑ گئی۔ یوں تو میری سمجھ میں پہلے ہی سے اُس کی دنیا اجڑی ہوئی تھی۔ اللہ نے اُسے اندھا پیدا کر کے اُس کو دنیاوی رونق سے محروم کر دیا تھا۔ فضلو میاں کے گھر چوری کی واردات کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ پولس میں مقدمہ درج ہوا۔ چوروں کی گرفتاری کے لیے پولس نے بھاگ دوڑ تیز کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو چار دنوں کے بعد سامانوں کے ساتھ پولس چوروں کو گرفتار کر کے تھانہ لے آئی۔ فضلو میاں اور اس کی بوڑھی بیوی کو تھانہ لایا گیا۔ برآمد سامان ان دونوں کے حوالے کر دیا گیا۔ پولس چوروں پر ڈنڈے برسا رہی تھی۔ حیرت سے میری نگاہیں اس لیے کھلی کی کھلی رہ گئیں کیوں کہ دونوں چوروں کی عمر ۲۵، ۲۵ سال کی تھی۔ گویا وہ جوان تھے۔ ساحل سے دور بھنور میں ایک کشتی ہچکولے کھا رہی تھی۔

✪✪✪

احساس کی لکیروں سے

خوبصورت جھیلوں اور پُر فضا وادیوں سے گھِرا ہوا یہ شہر تہذیب و شائستگی میں اپنا ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کی روایات بہت شاندار ہیں۔ اِس کا ماضی سنہرا، حال خوش گوار اور مستقبل تابناک ہے۔ خوش گوار موسم کے سبب فضا میں ایک طرح کا اعتدال ہے۔ یہاں کے باشندوں کی رفتار، گفتار اور مزاج میں ان سب کی جھلک ملتی ہے۔ گویا سکون قلب میسر ہے یہاں کے لوگوں کو۔ ہاں دیکھنے میں تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ اندر کا حال، دل کی کیفیت خدا جانتا ہے۔ عوام کے فیصلے ظاہری رکھ رکھاؤ پر ہی ہوتے ہیں۔ کون کتنا سکون میں ہے، کیسے ہے کتنی بے چینی، اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے علم نفسیات کے ماہر تو الگ، ہم اور آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

آنکھیں چار ہوتے ہی پیار کے دروازے پر دونوں دلوں کی دھڑکنوں نے دستک دی۔ محبت کی شروعات آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرنے سے ہوتی ہے۔ زبان سے اظہارِ محبت اتنی پُرکشش نہیں ہوتی جتنی آنکھوں کی زبان

سے ہوتی ہے۔ اِن تجربات کی وادیوں میں تا دیر سفر کر کے لوٹے میرے ایک دوست نے مجھے یہ بات بتائی۔ بھلا بتایئے میں کیسے یقین نہ کروں۔ پھر ہو جائے گی آپسی ناچاقی اور ٹوٹ جائے گی دوستی کی ڈور— ہاں! وہ دونوں پچھلے کچھ دنوں سے آنکھوں کی زبان میں ہی باتیں کرتے تھے۔ اظہار بیان کا وسیلہ اُن کی آنکھیں ہی تھیں۔ لب ہلتے نہ تھے۔ رائے زنی بھی آنکھوں کی زبان میں ہی ہوتی تھی۔ مسافر چاہے جتنا لمبا سفر کرے کسی نہ کسی منزل پر جاکر وہ رک ہی جاتا ہے۔ اور پھر یہی ہوا جمال کے ساتھ بھی۔ بے تابی میں ایک دن اُس کے لب تھرتھرائے۔ زبان کھلی اور اُس نے ریحانہ سے شادی کی بات کہہ دی۔ آنکھوں کے سفر نے زبان کی قدر کی۔ ریحانہ کی تمناؤں کے کنول کھل اٹھے۔ بلا تاخیر اس نے حامی بھری اور پھر چند دنو ں کے بعد ہی مذہبی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

دونوں کی زندگی بہت ہنسی خوشی گزرنے لگی۔ جمال پڑھا لکھا اور حساس تھا۔ کبھی کبھی وہ ریحانہ سے سنجیدہ گفتگو کرتے کرتے ہنسی مذاق بھی کر لیتا تھا۔ ایسا وہ اِس لیے کرتا تھا کہ ریحانہ کہیں خود کو تنہائی میں بوجھل محسوس نہ کرے۔ دونوں ایک شہر میں ایک جگہ تھے۔ جوانی کی دہلیز پر دونوں نے ایک ساتھ قدم رکھا۔ آنکھوں کی زبان سے اظہار محبت کے سفر سے بھی گزرے اور پھر رشتۂ ازدواج تک بھی پہنچے۔ اس درمیان انہوں نے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے۔

ایک دن جمال کے گھر کچھ دوست ناشتے پر مدعو تھے۔ باتیں اِدھر اُدھر سے ہوتے ہوئے سماجی زندگی اور اُس کے نشیب و فراز تک جا پہنچی۔ ''اپنا یہ شہر پتہ نہیں کیوں انتشار کی طرف جا رہا ہے۔'' جمال نے اپنے دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جا نہیں رہا ہے میرے دوست بلکہ انتشار کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔'' دوسرے نے کہا لیکن سوال یہ ہے میرے دوست کہ کون سے ایسے عوامل ہیں جو ہمارے اتحاد میں

انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے جھوٹے مفاد کی خاطر سماج کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ کچھ سطحی مزاج لوگ بڑے کام کی بات سوچتے ہی نہیں۔ آپ نے ٹھیک کہا میرے دوست۔ یہ شہر مختلف نسلوں والے الگ الگ مذہب والے، طرح طرح کے طور طریقے والے، مختلف زبان اور بولیوں والے، الگ الگ مسلک اور عقیدے والے۔ اقتصادی اعتبار سے کوئی بہت مضبوط تو کوئی بہت غریب۔ ان تمام نابرابری کے باوجود مختلف لوگوں کو آپس میں صرف ایک چیز جوڑتی ہے، اور وہ ہے ملک کی سیاسی وحدت۔ ہمارے ملک کا دستور اتنا بہتر اور اتنا اچھا ہے کہ دستور نے ہندوستان کے تمام باشندوں کو سیاسی لحاظ سے ایک قوم بنا دیا ہے۔ اب بھلا کوئی قومی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اُس سے بڑھ کر غدّار وطن کون ہوسکتا ہے۔ جمال کی دانشمندانہ اور منصفانہ گفتگو نے ماحول کو سنجیدہ بنا دیا۔ سبھی دوست ہاتھوں میں چائے کی پیالی لیے عقل اور شعور کی ایک ایک گھونٹ گویا حلق میں اتار رہے ہوں۔ دوست! ''اپنا یہ شہر پہلے کی طرح متحد اب کیوں نہیں رہا۔'' ایک سے نہیں رہا گیا۔ اُس نے سکوت توڑی۔ ''سمجھنے کی کوشش کرو میرے دوست''! ہوس پرستی، مادّہ، پرستی، نے کچھ لوگوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ نظام زندگی میں بدعنوانی، مختلف شعبوں میں اقرباء پروری، رشوت ستانی تعصب اور بے ضابطگی جیسی برائیوں کو مضبوطی ملے گی تو ظاہر ہے اس کا اثر تو سماج پر پڑے گا ہی۔ جب اخلاقی قدروں کا زوال ہوگا تو سماج میں بے حیائی، عریانی اور طرح طرح کی برائی ابھر کر سامنے آئے گی۔ جب تمام وسائل پر ایک طبقہ اپنی اجارہ داری بنائے رکھنا چاہے گا اور یہ روش برقرار رہی تو یہ تصور کرنا مشکل نہیں کہ ملک کا مستقبل کیا ہوگا۔ باہمی ٹکراؤ کے اسباب ایسے ہی تو جنم لیتے ہیں۔ آج انسان مادّہ پرستی کے جنون میں اپنی قدروں اور اپنی پہچان کو گم کرتا جارہا ہے۔ آج کا انسان اپنے زوال کا خود ذمّہ دار ہے۔ ہماری آبادی کے اکثر لوگ اپنے جسمانی عیش و آرام کے لیے اخلاقی تعلیم بھول چکے ہیں— حرام روزی برائی کو جنم

دیتی ہے۔ ریحانہ بڑی دیر سے جمال کے دوستوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ''ایسا ہے کہ ہم اللہ کی رسّی کو چھوڑ رہے ہیں۔ اس لیے اللہ کی رضا ہم سے دور ہو رہی ہے۔'' ریحانہ نے کہا— آج ہمارے معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ اس لیے کہ لوگ ایک دوسرے کے بہی خواہ نہیں رہے۔

ان خیالات کے اظہار کے بعد محفل برخاست ہوئی۔ اچھا تو اب ہم چلتے ہیں۔ احباب اپنے اپنے گھر گئے۔ دیکھو ریحانہ دنیا بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ جمال ریحانہ سے ہم کلام ہوا۔ یاد کرو وہ زمانہ جب ہم دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ تب اور اب میں کتنا بڑا فرق آ گیا ہے۔ پہلے اونچ نیچ کا فرق دیکھا جاتا تھا۔ ذات برادری کی قید تھی۔ رنگوں اور نسلوں کی پہچان کی جاتی تھی۔ لیکن دیکھتے دیکھتے اب پوری دنیا ایک ہتھیلی پر سمٹ کر آ گئی ہے۔ شہادت کی انگلی کو ذرا حرکت دی کہ ویب سائٹ اور انٹرنیٹ پر دنیا کی بے شمار معلومات سامنے حاضر۔ یہ جو اپنا شہر ہے دنیا کی تمام ضروریاتِ زندگی یہاں دستیاب ہیں۔ اب اپنے یہاں بھی ویب سائٹ پر شادی کا چلن بڑھ رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مذہبی اصولوں کی پاسداری کی جا رہی ہے۔ انٹرنیٹ پر اپنی رفیقۂ حیات کی تلاش میں بھی والدین کا ساتھ ہے۔ پہلے شادی پرانی جان پہچان، گاؤں علاقے، شہر کے گرد و نواح میں بڑی چھان پھٹک کے بعد طے پاتی تھی۔ لیکن سائنس کی ترقی نے پوری دنیا کو ایک گاؤں (Global Village) میں تبدیل کر دیا ہے۔ شادی کے لیے ہر دل عزیز ویب سائٹ پر رجسٹریشن میں پہلے ایک سال میں دو گنا اضافہ دیکھا گیا ہے۔ اس کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو لڑکے اور لڑکیوں کے والدین بھی اس ویب سائٹ پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ رشتے اب انسانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے مشینوں کے ذریعہ طے پا رہے ہیں۔

جمال کی معلوماتی گفتگو سنتے سنتے ریحانہ اپنے ماضی کی یادوں میں گم ہوگئی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ماضی کی داستان، حال کی ترقی یافتہ زندگی، منجدھار میں غوطہ لگاتے لوگوں کا تصور لیے جمال نے لمبی سانس لی۔ یاد کرو ریحانہ اپنا وہ پیارا سفر جو آنکھوں ہی آنکھوں سے شروع ہوا تھا۔ دل نے دل کو قبول کیا تھا اور پھر ہوگئی تھی شادی۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے رنگ، نسل، علاقائیت کی تمام حد بندیوں کو منہدم کردیا ہے۔ جمال اور ریحانہ ایک بار پھر ماضی کی داستان میں کھو گئے۔

✪✪✪

زخم

تم کسی کے دل میں دھڑکنے کی تمنا مت کرو! اگر تم نے محبت کا تاج محل دل کے درمیان بنانے کی آرزو کی تو دشمنانِ محبت حرکت قلب بند کردینے میں جٹ جائیں گے!! صبر اور سکون کا دامن پکڑو کہ تمہارے درد کا درماں ہوجائے گا— صبر اور سکون کی اچھائی سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر یہ کسی محرومی کا مداوا تو نہیں بن سکتے؟ صبر کریں بھی تو کس لیے اور کس کی خاطر— سمندر کی طغیانی میں کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر پہنچنے کی تمنا کون نہیں کرتا۔ مگر ساحل پر رسائی سے قبل ہی کسی نے کشتی میں سوراخ کردی تو صبر کا پیمانہ لبریز ہونے سے پہلے ہی کشتی میں پانی لبالب ہوجائے گا اور پھر چیخ و پکار کے درمیان کشتی سمندر کے اندر اُتر جائے گی— پھر شور اٹھے گا، ہنگامہ بپا ہوگا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آگ چاہے جسم میں لگے یا لکڑی میں دھواں ضرور اٹھتا ہے! کیا تم یہی چاہتے ہو کہ آگ لگی ہو تو چلاّیا نہ جائے بلکہ آسمان کی وسعتوں میں جھانک کر کالی گھٹاؤں کے برسنے کی آرزو کی جائے— ؟ اور پھر اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے

راکھ کا ڈھیر — سفیدی پر سیاہی کی چادر — اجلے رنگ کو بھدا کرتے کالے سائے۔

اللہ کی اس کائنات میں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ اسی دنیا میں کچھ لوگ آنسوؤں، آہوں اور کراہوں کے بیچ بھی جیتے ہیں تو کچھ لوگ پھولوں کی سیج پر کروٹ بدل بدل کر مست اداؤں والی حسیناؤں سے لبریز جام بھی ٹکرا کر کیف و مستی کی زندگی جیتے ہیں — کوئی لمحہ لمحہ جیتا ہے تو کوئی منٹ منٹ مرتا ہے۔ کسی کو کانٹوں کے بستر بھی نصیب نہیں ہیں تو کوئی نرم نرم پھولوں کی سیج پر سکون کی آغوش میں ہے — یہاں وفادار بھی ہیں اور غدار بھی، یہاں دل کے دشمن بھی ہیں اور دلدار بھی، کوئی دکاندار ہے، کوئی ناٹک کار ہے، کوئی قلم کار ہے کوئی فنکار ہے تو کوئی دل آزار ہے — اسی دنیا میں آدمی کی ایک ایسی قسم بھی یہاں رہتی ہے جسے زخم خوردہ کہتے ہیں۔ وہ انسانوں کے دیئے ہوئے دکھ کا مارا ہوتا ہے۔ سماج کے دیئے ہوئے زخم کا ناسور لیے پھرتا ہے۔ یہ وہ ہے جس سے سب کی ملاقات بھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ میں سمٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اشک بار ہو جاتا ہے۔ اس کی اداس پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ کبھی بھی خوش نظر نہیں آتا۔ اُسے کبھی نہ خوش رہنے کی سزا سماج بغیر محنت کے ایک ہی جھٹکے میں دے دیتا ہے اور پھر اداسی اس کے وجود کا حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اسی طرح کے سماجی حالات کے تھپیڑوں نے مار مار کر نرگس کو کمزور کر دیا تھا۔ اس کا قصور تو کچھ نہیں تھا بس یہ کہ وہ ایک سماج میں لڑکی کا وجود لے کر پیدا ہوئی تھی۔ نازوں سے پالی گئی تھی۔ ماں کی ممتا اس پر نچھاور ہوئی تو باپ نے محبت دی، بھائیوں کی شفقت اور بڑی بہنوں کی نیک تمنائیں اس کے ساتھ رہیں۔ ماں باپ نے پرورش کے ساتھ ساتھ اُسے زیورِ علم سے آراستہ کرنا بھی اپنا فرض سمجھا تھا۔ علم کی قندیلوں نے نرگس کو روشنی دی۔ نیک طبیعت باپ نے اپنا فرض پورا کرنے کی خاطر نرگس کا نکاح سماجی روایات کے مطابق گاؤں کے ایک نوجوان ظفر سے کر دیا۔ اس وقت نرگس کی عمر تیرہ سال کی تھی۔

دن بیتے۔ نرگس جوان ہوگئی۔ چمن میں جب پھول کھلتا ہے تو بے شمار کانٹے بھی اغل بغل میں اگ آتے ہیں— نرگس کے بھرے بھرے جسم، بڑی بڑی آنکھیں، شفاف پیشانی اور سرخ رخسار۔ اُسے چومنے کی خواہش میں کتنے بھنورے منڈلانے لگے۔ اختر بھی اپنی جوانی نرگس کے نام قربان کرنے کی خواہش لیے دل ہی دل میں کچھ کچھ سوچنے لگا تھا۔ وہ سوچتا کاش نرگس سے میرا بیاہ ہوا ہوتا۔ کاش نرگس میری راتوں کی رانی ہوتی۔ خوابوں کی شہزادی ہوتی، اگر میری شادی نرگس سے ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اُس کے دماغ میں عشق کی آندھی اور محبت کا طوفان اٹھنے لگا تھا۔ وہ نرگس کے گدرائے جسم سے اپنی زندگی کا رشتہ جوڑنا چاہتا تھا۔ اس کی بھرپور جوانی کا خیال اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچانے لگا تھا۔ اختر کے دل میں طوفان اٹھ رہا تھا کہ وہ کسی طرح اس کو اپنی زندگی میں لے آئے لیکن وہ مجبور تھا۔ نرگس کا نکاح ظفر سے ہوچکا تھا۔ شریعت مذہب اور قانون لڑکیوں کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرے مرد سے شادی کرے۔ اختر کی خواہش تھی کہ اپنی محبت کی منزل نرگس کو اپنی زندگی میں لے آئے اور اس خواہش کو ہوا دینے میں نرگس کے اندر سلگتی محبت کا اظہار بھی تھا۔ وہ دل سے اختر کو چاہنے لگی تھی۔ اختر تعلیم یافتہ بھی تھا اور خوبصورت بھی۔ اس کے گٹھے ہوئے جسم سے مردانہ رعب ٹپکتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی چاہت کے اسیر ہوگئے تھے۔ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی— وہ آگ تھی محبت کی— چاہت کی— پتہ نہیں ان کی نیت میں سے کوئی گناہ جھانک رہا تھا یا ایک دوسرے کو اپنی زندگی میں اتار لینے کا مقدس رشتہ۔

نرگس کے شایانِ شان ظفر نہیں تھا۔ وہ جب بچپن کی حد پار کرکے جوانی کی حد میں پہنچنے ہی والی تھی کہ اس کے والدین نے اس کا نکاح کرکے سماجی رسم کی پاسداری کی تھی۔ سماج کے رسم و رواج کے مطابق جوانی میں قدم رکھنے سے قبل کی شادی کو وہاں کی سوسائٹی میں نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔

''ارے بوڑھی ہوگئی شادی نہیں ہوئی— کیوں کوئی لڑکا اِسے پسند نہیں کرتا۔ ارے ہوگا کوئی عیب اِس میں تبھی تو بیاہ نہیں ہوا ہے اب تک اس بے چاری کا۔'' طرح طرح کے فقرے کستی تھیں بڑی بوڑھیاں اس لڑکی پر جس کی شادی پندرہ سولہ سال کی عمر تک نہیں ہوجاتی تھی۔ بڑی بوڑھیوں کے طعنوں سے لڑکیاں پریشان ہوجاتیں اور اسی رسم و رواج نے اس سماج میں ظفر جیسے جاہل زمیندار سے نرگس کی زندگی کو باندھ دیا تھا۔

قصور سماج کا تھا یا رواج کا یا نرگس کے والدین کا بہرحال دم گھٹ رہا تھا نرگس کا اس شادی کے جنجال میں۔ دونوں کے خیالات الگ تھے۔ دونوں کے انگ کے روپ الگ، دونوں کے مزاج جدا۔ ذہنی مطابقت نہیں ہونے کی وجہ کر زندگی اداس اداس رہتی۔ قلبی اور دماغی سکون میسر نہیں تھا۔ دونوں کی زندگی میں تناؤ رہتا تھا، الجھن تھی، بے چینی، بے قراری تھی، نرگس اپنی زندگی کو کوستی، دماغی الجھن اور ذہنی پریشانی سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ کبھی وہ کتابوں سے دل بہلاتی، کبھی ناول کے پنّے اُلٹتی، کبھی ٹیلی ویژن کا سہارا لیتی۔ دل بہلانے کے بہانے ڈھونڈتی لیکن اداسی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی، تو وہ فرسودہ رسم و رواج کو گالی دیتی۔ کبھی سماج کے ٹھیکیداروں کو جنھوں نے اس رسم کو جنم دیا تھا۔ وہ سوچتی آخر میں نے کون سا گناہ کیا ہے جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ تنہائی میں اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن کر برسنے لگتیں۔

وقت منزلیں طے کرتا رہا۔ اختر اور نرگس کی محبت کے چرچے ہونے لگے۔ لوگ اُن سے ملنے پر شک کرنے لگے۔ ہوا یوں کہ جن کانٹوں کو نرگس کی جوانی کی خوشبو نہیں لگ پائی اور آس لگائے اس کے گرد دھول چاٹتے رہے۔ دونوں کی محبت کو نمک مرچ لگا کر افواہیں گرم کرنے لگے۔ طرح طرح کی باتیں چوک چوراہوں پر بکنے لگے۔ اس کی زندگی میں زہر گھولنے کے لیے ظفر کے کان بھر دیئے۔ بے چارہ علم کی روشنی سے دور، دنیاوی چالوں کی سمجھ سے الگ اپنی بے وقوفی میں سمجھ بیٹھا کہ ہو نہ ہو یہی بات

ہے کہ نرگس مجھ سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ وہ مجھ سے کٹی کٹی رہتی ہے۔ وہ کیوں بجھی بجھی رہتی ہے۔ وہ مجھے کیوں نہیں چاہتی۔ آخر مجھ میں کیا کمی ہے— طرح طرح کے سوالات اس کے دل و دماغ میں وسوسہ بن کر ابھرنے لگے۔ ایک دن اُن کانٹوں نے ظفر کے دل میں جم کر بٹھا دیا کہ نرگس اختر کو چاہتی ہے۔ اسی لیے تم کو نظرانداز کرتی ہے۔ وہ تم کو حقیر سمجھتی ہے۔

ظفر نے سر میں گچھا باندھتے ہوئے اور اپنی مردانہ جلال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو یہ بات ہے میں اُسے مزہ چکھاتا ہوں۔ میں نے اسے طلاق نہیں دے دیا تو پھر میرا نام بھی ظفر نہیں— کانٹے اپنا کام کر گئے۔ بادِ سموم کا جھونکا چلا۔ طلاق...... طلاق...... طلاق کی تین آوازیں نرگس کی زندگی کو جدا کر گئیں۔

ایک پرندہ فضا میں محو پرواز تھا اور طوفان بھی تیز تھا۔ پرندہ کو تلاش منزل کی تھی، یا وہ اپنے نام کا رزق ڈھونڈنے نکلا تھا، طوفانِ حوادث نے اس کے پر نوچ ڈالے اور وہ زمین و آسمان کے بیچ اپنی منزل کھو بیٹھا۔

ظفر ایک جاہل زمیندار اور بے ڈھنگا تھا، یہ سب جانتے تھے اور یہ بھی کہ نرگس جیسی تعلیم یافتہ خوبصورت جوان لڑکی کا مزاج اس سے ہرگز نہیں ملتا۔ پر کسی کے جاننے اور نہ جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ سارا قصور تو نرگس کے والدین کا تھا جنہوں نے فرسودہ رسم و رواج میں اپنے خاندان کا نام اونچا رکھنے کے لیے جوان ہونے سے قبل بچپن میں نکاح کر دیا تھا۔

اختر کے فکر میں موڑ آنے لگے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ مطلقہ نرگس سے شادی رچائے یا نہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر تھی— وہ جب کبھی ہمت جٹاتا کہ چلو نرگس کے والدین کے پاس یہ بات کھول دوں کہ میں اس سے شادی کروں گا۔'' ایک تصور ابھرتا۔ اس کے سامنے چھ بچے لمبی قطار میں کھلونا، چاکلیٹ، بسکٹ اور سکّوں کی ضرورت کی لمبی فہرست لیے ہاتھ پھیلائے کھڑے نظر آتے۔ اور اس پر بات بات میں

طوفان اٹھانے والی بیوی کا چہرہ بھی سامنے گھوم جاتا— اس کی ہمت ٹوٹ جاتی۔ پھر محبت کی گرمی سے نرگس کے لیے اس کا دل پگھلتا۔ یک لخت ان خیالات کو جھٹک کر دور پھینکتا اور نرگس کی طرف بڑھتا، پھر رکتا، جھجکتا، سوچتا اور کچھ بڑبڑاتا۔ اُسے لگتا کہ اس کی بیوی بچوں کی ٹیم لیے اس کا پیچھا کررہی ہے۔ وہ نرگس کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا تھا— لیکن حالات نے سب پر پانی پھیر دیا۔ وقت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور اس کی تمناؤں کا خون ہوگیا۔

نرگس کی زندگی اداس ہوگئی تھی۔ وہ سوچتی کہ زمانہ کی کیسی عدیم النظیر سرد مہری اور ستم ظریفی ہے کہ کوئی میرا غم ہلکا نہیں کرتا۔ طلاق ہوئے پانچ سال بیت گئے۔ کہیں سے شادی کا پیغام نہیں آیا۔ ایک دو رشتے آئے بھی تو صاحب فرزند کے گھر کی بوڑھیوں نے کاٹ دیا کہ مطلقہ سے شادی کر کے تم اپنا آنگن نحس کرو گے۔ وہ سوچتی کہ کیا کرے۔ کبھی سوچتی ڈوب مرے، کبھی سوچتی ظفر کے پاس جاکر معافی مانگے۔ کبھی کچھ سوچتی کبھی کچھ— وہ الجھنوں میں گھری رہتی، روتی، بلکتی، بڑبڑاتی، ابھی بھی جوانی کا رنگ حسن و جمال میں اضافہ کررہا تھا۔ انہی دنوں اکبر نامی ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی نظر اس پر پڑی۔ نرگس کے لیے اس کے دل میں جگہ بن گئی۔ ماضی کے حالات سے وہ باخبر بھی ہوا۔ حالات کی نزاکت کو سمجھا۔ وجوہات کو جانا— اس کی چاہت طوفانی سمندروں سے زیادہ پُر جوش ہوگئی۔ وہ اسے کھرے سکے کی طرح خالص نظر آئی۔ وہ روشن خیال تھا۔ اس نے شادی کا پیغام نرگس کو دیا۔ اس کے گھر والوں نے مطلقہ سے شادی کرنے سے روکا لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ ۲۷/ جون کی شام شہنائی کی مدھر آواز گونجی۔ نرگس کے ہاتھوں میں مہندی نے رنگ جمایا۔ نرگس اور اکبر رشتۂ ازدواج میں قاضی کے خطبہ سے بندھ گئے۔

نرگس کی زندگی میں خوشیوں کی بہار لوٹ آئی۔ اُسے زندگی کے حسین باغ میں مرادوں کے پھول اور کلیاں ملنے لگیں۔ اس کی ہر خواہش کا احترام اکبر کرنے لگا۔

دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی تھی۔ اس کے دل ہنسی خوشی بیتنے لگے—— لیکن آج بھی وہ کبھی کبھی اداس ہوجاتی ہے۔ مایوسیوں میں گھر جاتی ہے۔ جب اسے اپنی زندگی کے بیتے دن یاد آتے ہیں۔ وہ رونے لگتی ہے جب جب اس کو طلاق کے پانچ سال کی طویل مدت میں طعنوں، لعنتوں اور ملامتوں کے بیچ کاٹنے کا خیال آتا ہے۔ وہ کوستی ہے اس سماج پر جس میں مطلقہ کوتو منحوس سمجھا جاتا ہے لیکن بچپن میں بچوں کی شادی کرکے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا جاتا ہے۔ وہ لعنت بھیجتی ہے ایسے فرسودہ رسم و رواج کو گلے لگانے والوں پر جو معصوموں کی زندگی سے مسکراہٹ چھین لیتے ہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کراداس ہوجاتی ہے کہ نہ جانے سماج کی کتنی بیٹیاں منحوس رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ رہی ہوں گی! کتنی زندگیاں سسک رہی ہوں گی!! کاش کوئی نجات دھندہ ہوتا!!

✪✪✪

آدمی کی بستی میں

اُس کا ماضی تابناک تھا اور حال بے حال تھا جب کہ مستقبل تاریک تھا۔ حالات کے پھیرے عجیب ہوتے ہیں۔ تغیرات کا چکر بھی عجب ہوتا ہے۔ عروج اور زوال کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ عروجِ آدم خاکی اور زوالِ آدم کا منکر بھلا کون ہوسکتا ہے؟ رات کی تاریکی دور بھگانے کے لیے دن کا سورج ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوتا ہے اور جب دن جوان ہوتا ہے تو رات پیچھا کر رہی ہوتی ہے۔ کہیں پہاڑ کی بلندی ہے تو کہیں زمیں کی پستی، کہیں دولت مندوں کی عزت ہے تو کہیں غریبوں کی ذلت۔ کہیں روپیوں کی کثرت ہے تو کہیں پیسوں کی قلت۔ قسمت کی دیوی مہربان تو گدھا پہلوان۔ حالات کے تھپیڑے پڑے تو حالت خراب۔

اِسی طرح حالات کے تھپیڑوں نے مار مار کر سلطان کو غریب کردیا جب کہ اس کے باپ دادا میر کبیر تھے۔ سلطان نے اپنے آبا و اجداد کے وہ دن بھی دیکھے تھے جب بڑے بڑے لوگ دربار میں جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔ خاندانی جھگڑے نے حالات

بدل دیئے۔ برے دن آئے۔ دیکھتے دیکھتے سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا۔ زمین بکنے لگی۔ باغات فروخت ہوگئے۔ مقدمات کی طوالت نے کمر کی گانٹھ ڈھیلی کردی۔ اب اس کی بلند عمارت کے ڈھانچے اس کا منھ چڑا رہے ہیں۔ غریبی ساتھ دینے سے بھی گھبراتی ہے۔ ہر طرف افلاس ہے اُس کو دنیا میں اپنا وجود اندھیرے میں بھٹکتا محسوس ہوتا ہے۔ آج کل اِس دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ اپنے بیگانے ہوگئے ہیں۔ رشتہ داروں نے منھ موڑ لیا ہے۔ بہی خواہوں نے قطع تعلق کرلیا ہے— وقت کا فاصلہ اپنوں کو بھی کیسا بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اِس کا اندازہ اُسے کب ہوا جب اس کی بیٹی جوان ہوگئی۔

سلطان جوان بیٹی کی شادی کی خاطر گاؤں اور علاقے کا چکر لگاتا ہے۔ ذہن میں رشتہ کے لائق لوگوں کا خاکہ تیار کرتا ہے۔ یکے بعد دیگرے سبھوں کے گھر جاتا ہے۔ کہیں سے روپیوں کی فرمائش ہوتی ہے۔ کوئی سامانوں کی لمبی فہرست تھماتا ہے۔ ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ، ٹی وی، واشنگ مشین، اسکوٹر، غرض کہ جیسے لوگ ویسی فرمائش۔ کوئی ۲۵، ۵۰ ہزار روپئے سناتا ہے۔ ایک شخص تو اسے دروازہ سے یہ کہہ کر بھگا دیا ہے اپنے بیٹے کو تمہارے ہی لیے لاکھوں روپئے خرچ کر کے پڑھایا ہے کیا؟ ہے تمہارے پاس پڑھائی میں ہوئے خرچ ادا کرنے کی طاقت تو کردو بیاہ وگرنہ جاؤ—" جہیز کی فکر نے اسے کئی سالوں سے چکر کاٹنے پر مجبور کردیا ہے۔ قصائی کی تیز چھری کے وار سے سہمی سہمی بکری کی طرح وہ لڑکے کے باپ کے یہاں جاتا ہے۔ اپنی امیری کی داستان سناتا ہے پھر اپنی غریبی پر کہانی کو ختم کرتا ہے۔ آخر میں اپنی بیٹی کی شادی کے لیے رشتہ مانگتا ہے۔ کہیں سے ڈانٹ سنتا ہے۔ کہیں پھٹکار۔ اداس پرندہ کی طرح بے سمتی کی منزلیں طے کرکے گھر لوٹتا ہے اور ایسا کئی سالوں سے کررہا ہے۔ بیٹی کی ڈھلتی عمر دیکھ کر رات کسی طرح کاٹ کر پھر صبح رشتہ کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ جوان بیٹی کا چہرہ دن بھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا نظر آتا ہے۔ بیٹی کی ڈھلتی عمر— بیاہ نہ ہونے

کا غم — سماج کی مانگ نے اس کی سوچوں کو منجمد کر دیا ہے۔ آج پھر وہ ایک جگہ سے بے نیل و مرام واپس آیا ہے۔ اب وہ ہر طرح سے تھک چکا ہے۔ سوچتا ہے کیا کرے۔ خودکشی کر لے یا بیٹی کو زہر دے کر مار دے۔

کبھی کبھی انسان ایسے موڑ سے گزرتا ہے کہ اُسے اپنی زندگی کانٹوں بھری راہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ سلطان کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہے۔ دنیا کے لوگوں کی رسمی گفتگو اور اخلاقی گراوٹ سے تنگ آ چکا ہے۔ انتظار اور کوشش کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ رشتہ کی تلاش میں پانچ سال گزر گئے۔ اس کی آنکھوں سے رات کی نیند اور دن کا سکون غائب ہے۔

رات ڈراؤنی ہے۔ رات کی تاریکی میں وہ نیند کا انتظار کر رہا ہے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا ہے۔ اس کے کمرے میں چراغ کی مدھم روشنی میں جوان بیٹی کا وجود ہاتھی کا بوجھ بنا دکھائی دیتا ہے۔ رشتہ کی تلاش میں بھٹکے دن ڈراونا منظر سامنے لاتے ہیں۔ اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے ہزاروں جلتے بجھتے بلب کی روشنی اُس کی آنکھوں پر اتار دی ہو۔ وہ بے چینی کے عالم میں کروٹ بدلتا ہے۔ بھٹکے دنوں کی یادیں اسے سانپ بن کر ڈس رہی ہیں۔ سوچتے کروٹ بدلتے، جھنجھلایا ہوا ایک فیصلہ کر کے اٹھتا ہے۔ ایک زوردار تلوار مار کر اپنی جوان بیٹی کا خون کر دیتا ہے۔ ایک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور رات کی تاریکی میں بھٹک کر گم ہوگئی اور رہ گئی ایک شریف خوبصورت نوجوان لڑکی کی لاش۔ جہیز کی کمی میں سماج کے بیچ سرد پڑی لاش!!

گاؤں کے لوگوں کو جب معلوم ہوا تو سلطان پر رحم کھا کر قتل کو پولس کو فطری موت بتا کر لوگوں نے لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔ معاملہ کو دبانے میں گاؤں والے کامیاب ہوگئے اور پولس کی گرفت سے سلطان بچ گیا۔

اس واردات کے بعد سلطان جہاں بھی رہتا اداس رہتا۔ اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا۔ اس کی نگاہیں بجھی بجھی رہتیں۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اس کے وجود پر کسی نے

لاشوں کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ مرجھایا چہرہ، سوکھی آنکھیں سر جھکائے کسی سوچ میں گم رہتا۔ ایسا لگتا جیسے کسی نے بھوسے میں ماچس مار دی ہو۔ اس کا وجود گیلی لکڑی کی طرح سلگتا معلوم ہوتا تھا۔

وقت کا پرندہ محو پرواز تھا۔ اس واقعے کو بیتے کئی سال ہوگئے۔ اب اس کی دوسری بیٹی بھی جوان ہوگئی۔ پھر وہی شادی کا مسئلہ سر ابھارنے لگا۔ جہیز کی مانگ، ڈانٹ پھٹکار، روپیوں کی کمی، بیٹی کا ناحق خون تمام واقعات اس کے ذہن و دل پر ہتھوڑے برسانے لگے۔ کیوں نہ سسرال والوں سے جواب بھی خوشحال ہیں مدد مانگی جائے۔ ایک دن سسرال کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ پہنچا اور اپنے مافی الضمیر کو بیان کیا۔ التجا کی۔ منت سماجت کے باوجود اسے کچھ نہ ملا۔ قسمیں کھا کھا کر لوٹا دینے کا وعدہ بھی کیا لیکن ''کون سنتا ہے فغان درویش'' کا مصداق بن کر اداس اداس بوجھل قدموں سے واپس ہوا۔ اسٹیشن پہنچ کر ٹکٹ لیا۔ پلیٹ فارم پر کھڑی ریل گاڑی کے اگلتے کالے دھوئیں کو دیکھ کر اجلی دھندلی یادوں میں گم ہوگیا۔ ڈبہ میں سوار ہوا گاڑی نے آہستہ آہستہ سرکنا شروع کیا۔ گاڑی دھواں اُگلتی گاؤں اور شہروں کو پیچھے چھوڑتی اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ ایک اسٹیشن پر پہنچ کر گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ دو مسافروں نے ایک اسٹیل بکس اسی ڈبہ میں لادا اور گاڑی کھلتے وقت ڈبہ میں نہیں چڑھے۔ سلطان نے سوچا ہوسکتا ہے یہ بیچارے چھوٹ گئے ہوں۔ گاڑی کھلتے وقت دوسرے ڈبہ میں چڑھ گئے ہوں۔ یکے بعد دیگرے چھوٹے بڑے اسٹیشنوں کو پیچھے چھوڑتی گاڑی اپنی منزل کے قریب ہوتی رہی۔ مسافر چڑھتے گئے اترتے گئے — اسٹیل بکس لادنے والوں کو نہ چڑھنا تھا نہ چڑھے۔ اب سلطان کو یقین ہوگیا کہ دونوں چھوٹ گئے ہیں۔ اس نے لات سے ہلا کر دیکھا واسٹیل بکس وزنی معلوم ہوا۔ شاید اس میں قیمتی مال بھرا ہو...... اس میں زیور بھی ہوسکتا ہے...... کپڑا بھی...... روپیہ بھی تو ہوسکتا ہے۔ سلطان کے ذہن و دل میں طرح طرح کی باتیں ابھرنے لگیں۔ اس کا ارادہ

بدلنے لگا۔ ہوسکتا ہے اسی سے اس کا کام چل جائے۔ مال غنیمت آنکھوں کے سامنے اور ہاتھوں کے پاس کوئی چھوڑ گیا ہے۔ چلو اس بکس کو اپنے گھر لے چلوں۔ شاید میری بیٹی کی شادی کے لیے مجھے اب بھٹکنا نہیں پڑے۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن و دل میں آتے جاتے رہے۔ منزل قریب آئی۔ اس نے اپنا دعویٰ ٹھونکتے ہوئے بکس پلیٹ فارم پر اتارا جو کافی وزنی تھا۔

بدیسی مال سمجھ کر پولس والے ایسے لپکے جیسے لاش کو دیکھ کر گدھ نوچنے کے لیے اتر آتے ہیں۔ ''کس کا بکس ہے؟'' ایک سپاہی نے سُرتی ملتے ہوئے پولسیا انداز میں پوچھا۔

''میری سپاہی جی!'' سلطان نے کہا۔

''کھول دکھا اس میں کیا رکھا ہے'' دوسرا سپاہی بکس پر ڈنڈا مارتے ہوئے بولا۔

''چابھی کھوگئی ہے سپاہی جی!'' سلطان نے سمجھانے کے انداز میں سپاہی کو کہا۔

''اے سپاہیوں کو بیوقوف بناتا ہے۔ اُلّو سمجھتا ہے۔ کھولتا ہے بکس کہ دوں اوپر سے دو چار ڈنڈے۔'' سپاہی نے رعب جمایا۔

''سر! کہا نا چابھی کھوگئی ہے۔'' سلطان نے دہرایا۔

یہ اسمگلر لگتا ہے۔ لگتا ہے اس میں بدیسی مال بھرا ہے۔ بہانے بنا کر نکل جانا چاہتا ہے۔ سپاہیوں نے آپس میں سرگوشی کی۔

اُدھر سلطان کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔ مال غنیمت نوچنے کہاں سے یہ پولس والے ٹپک پڑے۔ انہوں نے حصّہ بانٹ لیا تو اس کی بیٹی کا کیا ہوگا۔ لگتا ہے پھر شادی پیچھے پڑ جائے گی۔ دھت تیری قسمت کی! کہاں سے یہ پولس والے......

بھیڑ بڑھنے لگی کانا پھوسی سن کر انسپکٹر بھی پہنچ گیا۔ ''کیا معاملہ ہے؟'' انسپکٹر جوتے کی نوک سے بکس کو ہلا کر اس کے وزنی ہونے کا احساس پا کر پوچھا۔ ''لگتا ہے اسمگلنگ کا مال ہے؟'' توڑ دو تالا! حکم ہوتے ہی سپاہی نے ہتھوڑا مارا تالا ٹوٹ کر دور جا گرا۔ بکس کا ڈھکن اٹھایا گیا تو حیرت سے سب کے سب بھک بھو کر رہ گئے۔ سب

کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سب حیران کھڑے تھے۔ جیسے سبھوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ بکس میں صرف ایک لاش تھی — نوجوان لڑکی کی لاش!!

سلطان کی آنکھوں کے سامنے ہولناک منظر گھوم گیا۔ اس نے کیا سوچا تھا کیا ہو گیا۔

''دفعہ ۳۰۲ کے تحت اِسے گرفتار کرلو'' انسپکٹر کے حکم پر سلطان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ وہ پولس کے ساتھ جارہا تھا اور کہہ رہا تھا پولس والے اسے گرفتار کیوں نہیں کرتے جس کی وجہ سے قتل ہوتا ہے۔ لگتا ہے میری بیٹی کے خون نے پیچھا کر کے بیس سال بعد آج مجھے قاتل ثابت کردیا ہے۔ ایسے لالچی لوگوں کو گرفتار کیوں نہیں کرتے جس کی مانگ سے مجبور ہو کر جوان بیٹی کا خون میں نے کیا تھا۔ ہوسکتا ہے آج یہ خون بھی میری ہی طرح مجبور ہو کر کسی باپ نے کیا ہو۔ سلطان نے نفرت سے ایسے سماج کے نام پر تھوک دیا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے مڑ گیا۔

✪✪✪

تشنگی

آج صابرہ کو شوہر سے جدا ہوئے پانچ سال ہوگئے۔ آج وہ اس ظلم وستم دنیا میں اپنی عصمت وعفت دوشیزگی کے شفاف دامن میں چھپائے ہوئے اپنے باپ کے گھر تنہا زندگی کے مقرر ایام گن گن کر کاٹ رہی ہے۔ آج کوئی اس کے پاس شادی کا پیغام لاتا ہے تو وہ سن کر پاگل کی طرح بڑبڑانے لگتی ہے۔ رونے اور چلانے لگتی ہے۔ شادی اور مرد کا نام سن کر نفرت سے چہرہ چڑچڑا بنا لیتی ہے — شاید اسے نفسیاتی طور پر مرد ذات سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نفرت ہوگئی ہے۔

ساون کا پرکیف وسرور آگیں مہینہ اپنے دامن میں خوشیاں لیے فضاؤں میں ہریالی بکھیر رہا تھا۔ شام کے وقت بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں آسمان سے جھر کر فضاؤں کے دوش پر اٹھکیلیاں کرتی ہوئیں خراماں خراماں فرش خاکی پر آرہی تھیں۔ پپیہے ڈال پر نغمے الاپ رہے تھے۔ ہر چہار طرف ماحول پر جیسے بہار کی حکمرانی تھی۔ کھیتیاں بالیاں لیے چشم بینا کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں — اس پرسکون اور فرحت رسا ماحول میں

اٹھارہ سالہ حسن کا پیکر صابرہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے فضا میں نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ اس حسین ماحول نے اس کے دل و دماغ کو جوانی کے حسین باغ میں پہنچا دیا تھا— صابرہ سوچ رہی تھی کاش میرا منگیتر نسیم آج میری بانہوں میں ہوتا۔ کاش آج میں اس کی گداز بانہوں پر اپنا سر رکھ کر پیار و محبت کی دنیا میں کھو جاتی۔ کتنی خوشگوار ہوتیں ہماری گھڑیاں۔ کتنا پر سکون ہوتا ہمارا دماغ۔

صابرہ اس تنہائی میں آنے والے شادی کے دن اور سہاگ رات کا ایک حسین تصور اپنے ذہن میں لے کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ سوچتی تھی کتنی پر بہار ہوگی وہ رات جب میرا منگیتر نسیم چپکے سے آ کر اپنی انگلیوں سے میری نقاب کشائی کرے گا، میں شرما کر نگاہیں جھکا لوں گی۔ پھر وہ پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میرا چہرہ اٹھائے گا پھر نگاہیں چار ہوں گی اور ہم دونوں اس دنیا سے دور پیار کی دنیا میں کھو جائیں گے۔

لیکن کون جانتا تھا کہ حوادثات زمانہ اپنے دامن میں ایک سنگدل طوفان بھی لائیں گے جو صابرہ کے حسین و جمیل ارمانوں کے شیش محل کو چکنا چور کر دے گا— اور صابرہ حسرت بھری نگاہوں سے تمناؤں کے بکھرتے محل کو دیکھتی ہی رہ جائے گی۔

وقت کا پرندہ اپنی امتیازی رفتار کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے ایک سال کی ''منگنی'' کے طویل وقفہ کو پیچھے چھوڑ صابرہ اور نسیم کو شادی کے ایک مقدس رشتہ کی زنجیر میں باندھنے پہنچ گیا۔ نسیم شہنائی کی مدھر آواز میں خوشیوں کا خزانہ لٹاتے نوشاہ وقت بنا باراتیوں کے ہمراہ صابرہ کے دروازہ پر گیا۔ صابرہ کے دروازے پر پیٹرومکس کی روشنیاں بکھری پڑی تھیں اور ان روشنیوں کے بیچ ''اہلا و سہلا مربا'' کی صدائے بازگشت کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ قاضی نے خطبہ نکاح پڑھا۔ شادی کے رسومات پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

ادھر صابرہ کی سہیلیوں نے حنائی رنگوں سے نواز کر زیورات سے سجا کر اسے دلہن بنا دیا۔ شادی کے نغمے اور پھر رخصتی کے الوداعیہ گیت گاتے ہوئے اسے ڈولی میں بٹھا

دیا۔ تھوڑی دیر بعد صابرہ اپنے ساتھ جہیز میں ضرورت زیست کے بے شمار سامانوں کے ساتھ نسیم کے گھر زینت بن کر ڈولی سے اتری۔

وقت فیل بدمست کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ شام غم، صبح ناشاد، دودِ دلِ دردمند، زوال ہستی از اوّل تا آخر اس کی زندگی میں، جسم میں روح کی طرح پیوست کرگئی۔ حالات روز بروز اپنے دامن میں تشنہ لبی اور درد وغم لیے صابرہ کے آستانہ پر زنجیر بکف ہوتی۔ صابرہ کو سسرال میں قدم رکھے ہوئے سات ماہ گزر گئے۔ لیکن اب تک صابرہ جوانی کے خطہ نصف النہار پر کھڑی ''سہاگ راگ'' کا حسرت بھری نگاہوں سے انتظار کررہی تھی۔ اب تک اسے اپنے مجازی خدا کا پیار راس نہ آیا۔ سات ماہ کے طویل وقفے میں رات کی خاموشی نے کبھی بھی ''سہاگ راگ'' کو خوش آمدید نہیں کہا۔ ان اوقات میں صابرہ ہوتی اور اس کے ساتھ خاموش رات کی مہیب تاریکیاں۔ اب تک نہ تو اسے اپنے شوہر کے چہرۂ انور کا دیدار اور نہ ہی اس کے جسم کا لمس ہی نصیب ہوا تھا۔ صابرہ چراغ تلے اندھیرے کے جی رہی تھی۔ نہ جانے نسیم کو کون سا سانپ سونگھ گیا تھا کہ اتنی قربت کے باوجود بھی کشاں کشاں رہتا۔

رات آہستہ آہستہ شباب کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ صابرہ اپنے کمرے میں قندیل کی مدھم روشنی میں آنکھیں کھولے در دیوار پر حسرت بھری نگاہیں دوڑا رہی تھی، خوبصورت فریم اور رنگ برنگے کلینڈر سے مزین کمرہ آسیب خانہ بنا ہوا تھا۔ کمرہ کے در و دیوار اژدہا کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتے معلوم ہوتے تھے۔ صابرہ اپنی زندگی کی الجھی ہوئی گتھیوں کو دل ہی دل کراہ کر اور کبھی خاموش آنسو بہا کر اس تنہائی میں سلجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ دور دور تک نیند کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ شاید نیند اس کے پاس تک آنے میں خطرہ محسوس کررہی تھی۔ آدھی رات گئے خاموش احساسات وجذبات کی وادی بیکراں میں بھٹک رہی تھی۔ اتنے میں دروازہ پر زنجیر کھنکھٹانے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ وہ قندیل کی روشنی کو تیز کرتے ہوئے دروازہ کی چوکھٹ تک

آئی۔ لالٹین کی روشنی دروازہ پر کھڑے نسیم کے چہرہ پر بکھر گئی۔ جیسا کہ صابرہ نسیم کے سنے ہوئے چہرے سے آشنا تھی— اس نے پہلی ہی نظر میں نسیم کو پہچان لیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کی گفتگو نے اجنبیت کی دیوار گرادی۔ دونوں کے بیچ متعارفانہ گفتگو ہونے لگی۔

صابرہ کے دل و دماغ میں جو سات مہینوں سے اس قید خانہ کی زندگی نے درد کا ڈیرہ جما لیا تھا اور نسیم کی بے التفاتی کا لاوا جو دل ہی دل میں اُبل رہا تھا اس وقت جوالامکھی پہاڑ کا روپ اختیار کر گیا۔ صابرہ زوردار آواز میں گرج کر اٹھی۔ ''آپ نے مجھ سے شادی کر کے زندگی کا سکھ چین مجھ سے چھین لیا۔'' آپ نے مجھ سے ماں باپ کی شفقت، بھائیوں کی محبت، اور بہنوں کا پیار لے لیا۔'' آپ نے میری خوشیاں اور میرے ارمانوں کو کچل دیا مسٹر نسیم۔''

چیخو مت صابرہ! (نسیم جھلاتے ہوئے) ہوش میں بات کرو تم میری بیوی ہو۔''

صابرہ (گرجتے ہوئے) آپ کی چیخ میری آواز نہیں روک سکتی مسٹر نسیم! ہاں! میں مانتی ہوں کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ مگر پوچھتی ہوں کہ کیا بیوی کا حق اس کی زندگی اجیرن کر کے ہی ادا کیا جاتا ہے۔''

شاید آپ جانتے ہوں مسٹر نسیم! کہ شیش محل کے صاف و شفاف دیواروں اور فانوس و رنگین قمقموں کی مسحور کن رعنائیوں میں سامان تعیش فراہم کر کے کسی عورت کو سکھ چین نہں دے سکتے۔'' لوازمات زیست سے نواز کر اس کے ارمانوں کا چراغ نہیں جلا سکتے۔'' اس کے دل میں خوشیاں نہیں گھول سکتے مسٹر نسیم۔'' اس کے کشتِ حیات پر ابر رحمت بن کر نہیں برس سکتے بلکہ عورت کو بس اس کے مجازی خدا کا پیار ہی اس کی زندگی میں سپنوں کی بہار لا سکتا ہے۔'' جس عورت کو اس کے مجازی خدا کا پیار راس نہیں آتا وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی ہے۔ بولئے......! بولئے......!

''کہاں ہیں آپ! اور کہاں ہے آپ کا پیار!''

آخر کیوں آپ نے مجھے......؟ اس کی آواز پھٹنے لگی۔ نسیم (گرجتے ہوئے) بند

کرو اپنا بھاشن۔ تم میری نہیں تم تو ایک آوارہ مزاج لڑکی ہو۔ تمہارے بارے میں شبہات ہی نہیں ایقان بھی ہے۔ تمہاری آوارگی مجھ سے چھپی نہیں ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔''

کیا معلوم ہے آپ کو مسٹر نسیم! میں جانتی ہوں یہ سب بہانے ہیں۔ محض شبہات کی بنیاد پر کسی کی زندگی میں زہر گھول دینا مردانگی نہیں ہے نسیم صاحب! صابرہ جذباتی ہو چکی تھی — کیا ثبوت ہے آپ کے پاس۔ کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا —''

بند کرو اپنا بھاشن ورنہ...... ورنہ کیا؟ بولئے —! ورنہ تجھے طلاق دے دوں گا۔

تو سوچتے کیا ہیں؟ رک کیوں گئے؟'' آپ کی یہی مرضی ہے نا تو دیجئے مجھے طلاق۔''

خبردار —! جو آگے ایک لفظ بھی..........!

خبردار تو ہوں، آپ مجھے کیوں ڈراتے ہیں۔ دیکھو! اب بہت ہو گیا صابرہ —!''

سنبھل جاؤ ورنہ ابھی تیری.........

ہاں! ہاں!! کر دیجئے میری چھٹی۔

طلاق...... طلاق...... طلاق...... کی متواتر تین آوازیں نسیم کے منہ سے نکل کر صابرہ کے پردہ سماعت کو پار کر گئیں۔

وقت نے اس کی تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ وقت نے اس کی آرزوؤں کو مرغ بسمل کی طرح تڑپتا چھوڑ دیا۔ وقت کی بے اعتنائی اور حالات کی ستم ظریفی نے صابرہ کو چمنستان شباب میں شوہر کے فرحت رسا سائے سے جدا کر دیا اور جوانی کی تیز دھوپ میں ننگے سر کر کے اسے دنیائے حسرت سرا میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

بے گناہ قاتل

صبح کی سفید چادر آسمان پر پھیل چکی تھی۔ میں اپنے معمول کے مطابق قریبی چائے خانہ میں گیا تو خلاف اصول لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کررہے تھے کہ اتنے میں زاہد میری طرف مڑا، ارے یار! دیکھا تم نے کیا ہوگیا۔ لو! یہ دیکھو! اس نے ہاتھ میں لیے ہوئے اخبار کو میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اخبار جیسے ہی ہاتھ میں لیا میری نظر شاہ سرخیوں میں لکھے ہوئے ان جملوں پر پڑی۔

مورخہ ۷؍ جون ہوسپٹل کے مشہور ڈاکٹر کلیم کا بہیمانہ قتل۔ قاتل لاپتہ — پولس قاتل کی تلاش میں — ہنوز کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے۔

ارے یار! یہ دیکھو نا ڈاکٹر کی تصویر بھی چھپی — غنڈوں نے کس بے دردی سے مارا ہے کہ تصویر پہچان میں نہیں آتی۔

مورخہ ۸؍ جون شہر کے مشہور جوہری شری جواہرہ لال بھیانک خون، قاتل فرار،

پولس کی تلاش جاری، ابھی تک کوئی بھی گرفتار نہیں۔

آج بھی وہی ہنگامہ۔ قتل خون، آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ ارے آج کل شہر کے غنڈے ادھم مچا رہے ہیں۔ نہیں...... نہیں...... ایسا لگتا ہے کہ کوئی پرانی دشمنی چکا رہا ہے۔ دیکھو تو کس بے دردی سے چھرا مارا ہے کہ چہرہ کا رنگ ہی بگاڑ دیا ہے۔ اس بیچارے نے آخر کیا بگاڑا ہوگا۔ لوگ آپس میں اظہار خیال کر رہے تھے۔

جہاں کہیں بھی دو چند افراد جمع ہو جاتے ڈاکٹر کلیم اور جوہری جواہرہ لال کے خونی حادثے پر گپیں چھڑ جاتیں۔ چائے کی دوکانوں میں، چوک پر، پارک اور ہوٹلوں میں دو روز سے سنگین حادثے نے اپنا عنوان قائم کر رکھا ہے۔

مورخہ ۹/ جون آج تیسرے روز بھی قتل کا سنسنی خیز واقعہ شہر کے مانے ہوئے انسپکٹر کمال حسین کا پر اسرار قتل— قاتل گرفتار۔ قاتل پولس کی حراست میں۔ پولس معاملہ کی چھان بین کر رہی تھی۔ ابھی تازہ ترین ملی خبروں کے مطابق پچھلے دونوں خونی واقعہ کا مجرم قاتل ہی ہے۔ قاتل نے اپنا نام سلطان رکشہ والا بتایا ہے۔

کچہری، مقدمہ— عدالت— مجرم— فیصلہ—

آج قاتل سلطان کے مقدمہ کا دن تھا۔ لوگ اس پر اسرار قتل کی کیفیت جاننے کے لیے شہر کے گوشہ گوشہ سے سمٹ کر کچہری میں جمع تھے۔ عدالت میں لوگوں کا اژدہام، کرسی عدالت پر جلوہ افروز مجسٹریٹ، مقتولین کے دوستوں کی لمبی قطاریں، مقدمہ کی سماعت کے لیے وکلاء کی بھیڑ، عدالت کے کمرہ میں کہیں بھی ایک تنکا رکھنے کی جگہ نہیں۔

مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزم کٹہرے میں کھڑا عدالت کے کمرہ میں لوگوں کی بھیڑ دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں وکیل کی آواز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام سلطان ہے'' ملزم نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تم کیا کرتے ہو یعنی تمہارا پیشہ کیا ہے؟'' وکیل نے پوچھا۔

''جی میں رکشہ چلاتا ہوں'' سلطان نے جواب دیا۔

''اچھا سلطان! تو تم پر قتل کا الزام ہے کہ ابھی اس شہر میں جو تین خونی واقعات رونما ہوئے ہیں ان تینوں کے قاتل تم ہی ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان تینوں کا خون تم نے ہی کیا ہے۔'' وکیل نے سوال کیا۔

''جی ہاں! میں نے ہی ان تینوں کا خون کیا ہے'' سلطان نے بلند آواز میں جواب دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ سارے خون تم نے کیوں کئے؟'' وکیل نے تجسس بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''وکیل صاحب! آپ مت پوچھئے کہ میں نے تینوں کا خون کیوں کیا۔ میں نے ان کو موت کے گھاٹ کیوں اتار دیا۔ مت پوچھئے وکیل صاحب...! یہ ایک لمبی داستان ہے۔ آپ صرف اتنا جان لیجیے کہ ان تینوں کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی خون کیا ہے۔ لائیے ہتھکڑی اور پہنا دیجیے مجھ کو! لگا دیجیے میرے پیروں میں بیڑیاں دے دیجئے مجھے پھانسی۔ بھیج دیجئے مجھے جیل۔۔۔ مگر مت پوچھئے کہ میں نے یہ خون کیوں کیا۔ آپ نہیں سن سکتے وکیل صاحب!'' سلطان زور زور سے عدالت میں چیخ رہا تھا۔

لوگ بڑی خاموشی سے مقدمہ کی کارروائی سن رہے تھے۔ سارے مجمع پر سکوت طاری تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لوگوں کی زبانوں پر قفل خاموشی لگ گیا ہے۔

''سلطان! ہوش میں آؤ! یہ عدالت ہے۔ میں عدالت کی توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ ہمیں یہ بتانا ہوگا کہ آخر تم نے یہ خون کیوں کیا؟

''سلطان ابھی زیر لب بڑبڑا ہی رہا تھا کہ جج کی زوردار آواز گونج اٹھی۔ حضور! وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا اگر آپ کو بتاؤں تو آپ کہیں گے سلطان جھوٹا ہے۔ مکّار ہے۔ لیکن نہیں...... خدا کی قسم میں جھوٹا نہیں...... مکار نہیں بلکہ

قتل کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔''

''اچھا تو پہلے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر کلیم کا خون کیوں کیا؟'' وکیل نے سوال کیا۔

سلطان مسکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی قریب کی داستان کھل کر تھرتھرانے لگی۔

''حضور! یہ ڈاکٹر نہیں بھیڑیا تھا بھیڑیا— آج سے ایک مہینہ پہلے میرا بیٹا سخت بیمار ہوا۔ میں غریب آدمی۔ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر سے علاج کراتا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ گورنمنٹ ہوسپٹل میں لے چلوں جہاں میرے بیٹے کا علاج ہو جائے گا۔ کیوں کہ سرکار نے تو وہاں بہت کچھ دیا ہے۔ ڈاکٹر— دوا— کھانا پینا— سب کچھ— یہی سوچ کر میں نے اپنے بیٹا کو ہوسپٹل میں بھرتی کردیا— لیکن مت پوچھئے حضور! میں نے یہ سب کچھ سنا اور سوچا یہی تھا۔ ہوسپٹل میں دیکھنے کو نہ ملا۔ ہر دن کسی ڈاکٹر کو باوا دادا کہہ کر بیٹا کو دکھلا دیا کرتا تھا۔ دوا اور کھانے کا انتظام ان ہی دو چار پیسوں سے کرتا جو محنت و مزدوری سے حاصل ہوتا تھا۔ میرا بیٹا دن بدن بیمار ہوتا گیا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اس کی سانس بند ہونے لگی۔ بدن ٹھنڈا پڑنے لگا۔ آواز بند ہوگئی۔ میں دوڑتا ہوا ڈاکٹروں کے کمرہ میں گیا۔ وہاں ڈاکٹر کلیم ہی تھے۔ جو اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ گپ کررہے تھے۔ میں نے کہا سرکار جلدی کیجیے میرا بیٹا مرا جارہا ہے۔ اس کی آواز بند ہوگئی ہے۔ خدا کے لیے ذرا جلدی کیجیے۔ ڈاکٹر مجھ پر برس پڑا۔ کمبخت، نیچ، ذلیل، دیکھتا نہیں میں کن سے باتیں کررہا ہوں۔ چلا آیا ہنگامہ مچانے۔ مر رہا ہے تو میں کیا کروں— میں ڈاکٹر کے پیر پر گر پڑا۔ سرکار بچا لیجیے۔ میرے بیٹے کو ورنہ وہ مر جائے گا۔ ڈاکٹر نے زور سے جھٹک دیا، میرا سر ٹیبل سے جا لڑا۔ خون بہنے لگا۔ اور وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے نہ جانے کہاں چل دیا۔ جب میں ماتھے پر بہتے ہوئے خون کو ہاتھ سے دبائے اپنے بیٹا کے پاس پہنچا تو میری بیوی رو رہی تھی— اور میرا جوان بیٹا مر چکا تھا۔''

''سرکار! میرا ایک ہی جوان بیٹا تھا اور اس کی بھی اس راکھشس نے جان لے لی۔ وہ ڈاکٹر نہیں خونی تھا۔ ڈاکو تھا۔ ڈاکو تھا سرکار!''

عدالت کی فضا پراسرار بن گئی تھی۔ سلطان پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ کہے جارہا تھا۔ اور اب رہا وہ جوہری جس کا نام جواہرہ لال تھا تو آپ جان لیجیے کہ یہ بھی کچھ کم حرامی اور ڈاکو نہیں تھا۔ یہ اتنا بڑا حرامی تھا سرکار کہ دولت کی آڑ میں غریبوں کا خون چوستا تھا غریبوں کی جوان بیوی اور بیٹیوں کی عزت لوٹتا تھا۔ یہ بڑا پاپی تھا حضور!

یہ وہ خونی بھیڑیا تھا جس نے میری بیٹی کی عزت لوٹ لی۔ سلطان کی آنکھوں میں خون کے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ اس کا چہرہ انگاروں کی طرح سرخ ہوا جارہا تھا۔ اس کی زبان سے نکلنے والی آواز بھاری ہوگئی تھی۔

سرکار! آج سے ایک ہفتہ پہلے جب میں رات کے دس بجے رکشہ چلا کر گھر لوٹا تو میں نے اپنے دروازہ پر لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ تیز تیز قدموں سے بھیڑ چیرتا آنگن میں پہنچا تو میری بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ مجھے یہ ماجرا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں صرف اتنا سمجھ سکا کہ کوئی حادثہ ہوا ہے۔ اتنے میں دو چار عورتیں کہنے لگیں ارے سلطان بھیا۔ ظلم ہوگیا جواہرلال ایک گھنٹہ پہلے دس بارہ غنڈوں کے ساتھ آیا تھا۔ منیا کو اپنے غنڈوں سے اٹھوا لیا جب بھابھی نے منیا کو چھڑانا چاہا تو اسے بری طرح مارا۔

''یہ سن کر میرا ہوش اڑ گیا میں مجبور و بے بس کر بھی کیا سکتا تھا۔ روتا پیٹتا پولس اسٹیشن پہنچا میں نے انسپکٹر کمال حسین سے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس نے کہا تم جاؤ میں ابھی جواہرلال کے گھر کی تلاشی لیتا ہوں۔ میں دوڑتا ہوا اپنے گھر لوٹ آیا۔''

''کل ہوکر میں پھر پولس اسٹیشن گیا تو انسپکٹر کی جیپ میں جواہرلال کو دیکھ کر خوش ہوگیا کہ اب میری بیٹی مل جائے گی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد پھر دونوں جیپ میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلے گئے اور میں چپ چاپ بیٹھا رہ گیا۔ دو گھنٹہ بعد انسپکٹر تھانہ پہنچا تو میں نے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھا۔ انسپکٹر بڑی صفائی سے کہہ گیا کہ میں نے جواہرلال

کے گھر کی تلاشی کر لی۔ وہاں تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ وہ تو بڑا نیک اور شریف آدمی ہے تم خواہ مخواہ اس پر الزام لگا رہے ہو۔ وہ تو کل دلّی میں تھا۔ اس شہر میں وہ تھا بھی نہیں۔''

''میں نے انسپکٹر کی بہت خوشامد کی۔ ہاتھ چھوڑا کہ کہیں سے میری بیٹی منیا کو تلاش دے۔ لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ کیوں کہ انسپکٹر تو جواہر لال سے پانچ ہزار روپئے رشوت لے چکا تھا۔''

''جج صاحب! اور ٹھیک چار دن کے بعد میری بیٹی منیا کی تلاش چوراہے پر پائی گئی — میں لٹ گیا سرکار میں برباد ہو گیا...... مجھے نفرت ہوگئی اس زندگی اس سماج سے جس میں غریبوں کی عزت پیسوں کے زور پر لوٹ لی جاتی ہے۔ اس ماحول سے جس میں قانون کو پیسوں سے خرید لیا جاتا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگا اس دھرتی پر...... جس دھرتی پر غریبوں کے خون کی کوئی قیمت نہیں۔ کوئی بدلہ نہیں سرکار! یہ قانون، یہ پولس، یہ ڈاکٹر، یہ بڑے بڑے لوگ بھیڑیئے ہیں — بھیڑیئے ہیں حضور!''

''میں نے ٹھان لیا کہ میں ان درندوں کا خون پی جاؤں گا جنھوں نے میری عزت لوٹ لی۔ میں نے خون کر دیا — تاکہ یہ پھر کسی غریب کی عزت کو کھلونا نہ بنائیں اور کسی مجبور کا خون نہ چوسیں۔''

''پہنا دیجئے ہتھکڑی — مجھے بھیج دیجئے جیل، میں خوش ہوں سرکار ان درندوں کا خون پی کر میں خوش ہوں۔'' کہتے کہتے سلطان زور زور سے ہنسنے لگا۔

''ملزم نے تینوں خون کا اقبال جرم کر لیا ہے۔ اس لیے اسے تعزیرات ہند دفعہ ۳۰۲ کے تحت عمر قید کی بامشقت سزا دی جاتی ہے۔''

جج کا آرڈر سنتے ہی سلطان نے زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہوں کی گونج چاروں طرف پھیل گئی — وہ ہتھکڑی پہنے ہوئے جیل کی جانب جا رہا تھا۔ اس کے چہرہ سے خوشیوں کے پھول جھڑ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس نے کوئی بازی جیتی ہو۔

✪✪✪

مجرم کون ہے

وہ نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں رنگ برنگے پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو حیرت سے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے— وہ زندہ کیا ہے بس یوں کہ زندگی کے نام پر ایک چلتی پھرتی لاش۔ وقت کی دیوی نے اس کے ساتھ مہربانی نہیں کی ہے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا ہوگا جس کی زد میں وہ اس درخت کی مانند اجڑ گیا ہے جس کی شاخیں گر گر ٹوٹ چکی ہیں— پچکے ہوئے گال اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اس کی دردناک زندگی کی چغلی کھا رہی تھیں۔

ایک مہینہ سے میں اس نوجوان کو یہیں دیکھتا ہوں۔ وہ دن بھر نہ جانے کہاں کہاں رہتا ہے اور شام ہوتے ہی منیجر پرکاش کی حویلی پر حاضر ہو جاتا ہے۔ دیکھنے میں تو وہ پڑھا لکھا لگتا ہے پر نہ جانے اس نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے۔ شاید ذہنی طور پر پریشانی کا شکار ہوگیا ہے۔ وگرنہ آج اس کی شکل وصورت ایسی نہ رہتی۔ میں

جب بھی اسے دیکھتا میرے ذہن میں یہی سب باتیں ابھرنے لگتیں۔ ایسے میں کبھی زمانے کا ستایا ہوا اور کبھی غریب و نادار یا پھر ضرورت مند سمجھ کر اپنی راہ لے لیتا۔ منیجر پرکاش کی حویلی میرے کمرے سے دو چار مکان کے بعد تھی۔ میں جب کبھی اس راستے سے گزرتا اچانک میری نگاہ حویلی کی جانب اٹھ جاتی۔ اس نوجوان پر نظر پڑتی۔ پھر دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

ایک شام جب میں بازار سے لوٹ رہا تھا تو پھر وہی ہوا جیسے ہی میری نگاہ اس کے چہرے سے ٹکرائی میں ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں نے آج تک کسی نوجوان کو ہچکیوں سے روتے نہیں دیکھا تھا۔ میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے اندر کی انسانیت جاگ اٹھی۔ میں نے اپنے دل میں عجیب سا درد محسوس کیا۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم اس کی جانب بڑھنے لگے۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ایک بوسیدہ رومال سے آنسوؤں کو پونچھنے لگا۔

''بھائی جان! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے کچھ پوچھوں۔''

وہ اپنی جگہ پر سنبھلتے ہوئے بغیر کچھ کہے سر کو پکڑ کر سسکیوں میں ڈوب گیا۔

''میں آپ سے باتیں کر کے آپ کا مذاق اڑانا نہیں چاہتا۔''

چند ثانیے بعد میں بول پڑا۔

اس کی سسکیاں تو بند ہو گئیں پھر بھی وہ کچھ بولنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی خاموشی میری بے قراری میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر ایک انسانی ہمدردی کے ناطے بے قرار ہوا جا رہا تھا۔

وہ بھی اپنا درد ہلکا کرنے کے لیے مجھ سے گویا ہوا— یوں بھی تو انسان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنی مصیبت کی داستان دوسروں سے کہتا ہے اور ایسا صرف اس لیے کہ اس کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔

''بھائی جان! آپ میری مصیبت کی داستان جان کر خواہ مخواہ پریشان ہوں گے۔اس لیے مجھے خاموش ہی رہنے دیجیے۔''

میری پریشانی میں مزید اضافہ ہورہا تھا۔ میں نے اسے کچھ کہنے کے لیے اصرار کرنا شروع کردیا۔کافی اصرار کے بعد وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے اپنی داستانِ غم سنانے لگا۔

''میں یہاں سے دور ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میں نے پانچ سال قبل بی۔اے پاس کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں پڑھا لکھا ہوں لیکن یہ بھی ایک دردناک حقیقت ہے کہ میں مختلف تھپیڑوں کے بعد اس ڈگری تک پہنچا ہوں۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ میری تین بہنیں ہیں۔ والدہ جن کی بڑھاپے کی وجہ سے آنکھوں کی بینائی نے جواب دے دیا ہے۔ والد بڑھاپے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ میرے والد نے محنت و مزدوری کرکے میرے تعلیمی سلسلہ کو برقرار رکھا تھا۔ وہ اس لیے کہ والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھتی رہے۔ اسی خواہش کی تکمیل کے لیے میرے والدین نے مجھے گھریلو کاموں سے الگ کرکے میری تعلیم کی خاطر دن اور رات ایک کردیا۔ میرے والد محنت مزدوری کرکے تعلیمی اخراجات برداشت کرتے رہے اور میں پڑھتا رہا۔ میں اب تک ہر امتحان میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتا رہا۔ اپنی کوشش کا ہی نتیجہ ہے کہ میں B.A فرسٹ کلاس پاس ہوں۔''

''ایک طرف جہاں میں اپنی ڈگریوں اور اپنی تعلیم پر خوش ہوتا ہوں وہیں دوسری طرف اپنی بے روزگاری اور خستہ حالی پر نادم ہوجاتا ہوں۔ آج تعلیم اور ڈگری کی خوشیوں پر بے روزگاری اور زبوں حالی کی ندامت غالب آگئی ہے۔کبھی تو ایسی ڈگریوں کو جلا دینے اور کبھی خود کو موت کی گود میں ڈال دینے کو جی چاہتا ہے۔ آخر میں کروں بھی تو کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟کس سے مدد مانگوں؟کسے آواز دوں اور کس کو پکاروں؟

کئی سالوں سے میں نوکری کی تلاش میں شہر شہر گھوم رہا ہوں۔ آفسوں کی خاک چھان رہا ہوں۔ پر نہ جانے میری قسمت کاتب تقدیر نے رات کے کس حصہ میں لکھی ہے۔ بہت دنوں بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میری غربت ہر روزگار کے پیچھے آڑے آتی ہے۔ اسی غربت کا نتیجہ ہےکہ میں اب تک بیکار ہوں۔ میرے وہ ساتھی جن کے ذرائع اور وسائل مضبوط ہیں کب کے نوکری پا چکے ہیں۔ اگر کوئی بیکار ہے تو وہ میں ہوں۔''

''زمانہ نے کیا روش اختیار کرلی ہے۔ کیا اس دنیا میں غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا تماشہ کھڑا کر دیا ہے لوگوں نے؟ کئی جگہوں میں تو ایسا ہوا کہ جب میں انٹرویو دینے گیا تو معلوم ہوا کہ دس ہزار روپئے کہیں بیس ہزار روپئے اور کہیں مختلف مطالبات رشوت میں کی گئیں۔ میں مجبور انسان جو دو وقت کی روٹیوں کا انتظام مشکل سے کر پاتا اتنے روپے کہاں سے لاتا۔ نوکری کے بجائے مجھے مایوسی ملتی رہی۔''

وہ نوجوان درد میں ڈوبا ہوا کرب کی داستان سنا رہا تھا اور میں خاموش اس کی داستاں بغور سن رہا تھا۔

''اچھا تو آپ ہفتوں سے یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے سوال اٹھا ہی دیا۔ سنئے—!'' آج سے تین ماہ پہلے منیجر پرکاش کی فیکٹری میں ایک کلرک کی جگہ خالی تھی۔ معلوم ہوا اس جگہ پر بحالی روپیوں کے عوض ہوگی۔ جیسا کہ میں ماضی کی تلخیوں اور رشوت کے رموز و حقائق سے واقف تھا۔ پرکاش کو رشوت دے دینے سے میرا مستقبل خوشگوار نظر آنے لگا۔''

میں منیجر سے ملا۔ اس سلسلے میں گفتگو کی۔ اس نے کچھ پوچھنے کے بعد کہا کہ ''تمہاری نوکری ہو جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ بیس ہزار روپئے انٹرویو سے پانچ روز قبل میرے یہاں جمع کردو۔''

''مرتا کیا نہیں کرتا۔ میں دوڑا دوڑا گھر پہنچا اور اپنے بوڑھے والد سے رشوت کے متعلق ساری کہانی سنا دی۔ والد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہوں نے کہا دیکھو

بیٹا! میرے پاس تو کچھ رہ نہیں گیا ہے جس سے تمہاری رشوت کی رقم بھر دوں صرف مکان بیچ کر رشوت کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔''

''اس طرح میرے والد نے مکان کو بیچ دیا اور میں منیجر پرکاش کی فرمائش کے مطابق بیس ہزار روپے لے کر بروقت ان کی حویلی پر حاضر ہوا۔''

''انٹرویو میں بہت سارے لوگوں کے ساتھ میں بھی شریک ہوا۔ میرا انٹرویو بہت اچھا ہوا۔ میں اندر اندر کافی خوش تھا— کہ اب میرے بوڑھے باپ کا اور تین جوان بہنوں کی خوشیاں لوٹ جائیں گی۔ ماں خوشیوں سے پھولے نہیں سمائے گی۔ میری تینوں بہنیں دلہن بنا کر ڈولی میں بٹھا دی جائیں گی۔ گھر کا ماحول سہانا ہو جائے گا۔''

''ایک ہفتے بعد جب نتیجہ نکلا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ آرزوؤں اور حسرتوں کی دنیا اجڑ گئی۔ ارمانوں کا قافلہ لٹ گیا۔ میں رویا...... چلایا...... اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس عہدہ پر منیجر کے بھائی کی بحالی ہو گئی اور میں خاموش کھڑا تماشہ دیکھتا رہ گیا۔''

''جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میری بحالی نہ ہونے پر میں نے منیجر سے روپے طلب کیے۔ اس نے دو چند دنوں بعد دینے کا وعدہ کیا۔ میں پھر پہنچا۔ پھر اگلے دن کا وعدہ کر کے لوٹا دیا۔ کئی مہینوں سے کل کے وعدہ پر مجھے ٹالتا رہا ہے۔ ابھی تک مجھے ایک روپیہ بھی نہیں لوٹایا۔ کبھی آفس بلاتا ہے تو کبھی مکان پر۔ دن بھر اس کے آفس کے گرد چکر لگاتا ہوں اور شام ہونے پر مکان کا۔ مہینوں سے یہی کام اور روٹین ہے۔

لیکن یہ منیجر......! آج ایسا ہوا کہ جب میں نے زوردار آواز میں اپنا روپیہ طلب کیا تو اس نے دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اس نے مجھے گالیاں دی ہیں۔ دھکا دے کر مجھے اپنے کمرے سے باہر نکال دیا ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ جاؤ میں تمہارے روپیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جاؤ— جہاں کھوجنا ہے کھوجو—!''

''تقدیر نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ میں اپنی قسمت پر آنسو بہانے کے سوا

کر بھی کیا سکتا ہوں؟ میں کون سا منھ لے کر اپنے باپ کے پاس جاؤں۔ کون میرے گھر والوں کا سہارا بنے گا؟ میری تینوں جوان بہنوں کی مانگیں سندور کے بنا سونی رہ جائیں گی۔ اب تو اپنا مکان بھی نہیں رہا۔ کون سہارا دے گا ایسے بے گھر والوں کو؟— اب تو نوکری بھی گئی اور روپیہ بھی۔

''اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ اس طرح آپ کی زندگی کوئی چھین لے اور آپ کی قسمت آپ سے روٹھ جائے۔ آپ کا کوئی گھر نہیں، اپنا ٹھکانہ نہیں، تو آپ زندہ رہنے کی آرزو کریں گے یا موت کی؟'' بتائیے! جواب دیجیے!

وہ تعلیم وہ ڈگری جس کے حصول کے لیے میں نے ماں، بہن، ماں، رشتہ دار کو چھوڑ کر دنیا کی تمام چیزوں سے ناطہ توڑ لیا۔ والدین موت کے قریب پہنچ گئے۔ مکان بک گیا۔ روپے لٹ گئے، بہن کی مانگیں سندور کے بنا ترس رہی ہیں— پھر آپ ہی بتائیے میں کیا کروں—؟'' کس کو پکاروں کس کورٹ میں اپنی فریاد کروں کہاں چیخوں؟ کہاں چلاؤں؟''

بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان امڈ پڑا۔ وہ زار و قطار رونے لگا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہچکیاں آنے لگیں۔ میں برف کے سل کی طرح پگھل گیا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ''ارے بھائی گھبراؤ نہیں۔! زندگی خوشی اور غم کے امتزاج کا نام ہے۔ مصیبت سے کسی کو چھٹکارا نہیں ہے۔ وقت اور حالات یکساں نہیں رہتے۔ مشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا انسانیت کی موت ہے۔ دوست! بہادری اس میں ہے کہ مصائب کے طوفان سے لڑتے ہوئے زندہ رہنے کا گر سیکھ لیا جائے۔ وقت ایک ایسا مرہم ہے جو گہرے سے گہرے زخم کو بھی بھر دیتا ہے اور تم تو تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ تم دنیا میں جینے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔

میں اسے پُرحوصلہ انسان کی طرح جینے کی تلقین کر رہا تھا۔ میرے سینے میں ایک

نامعلوم سا درد تھا۔ جب میں نے اس کے چہرے پر سے اداسی کی لکیر مٹتے دیکھی تو دیگر ضروریات کی تکمیل کے لیے چلا گیا۔

دوسرے دن جب میں اس راستہ سے گذرا تو وہ نوجوان وہاں نہیں تھا۔ دو چند دن میں نے اسے نہیں دیکھا تو میں نے سمجھا کہ اب وہ بے چارہ اپنے گھر لوٹ گیا ہے۔''

ایک ہفتہ بعد ایک صبح جب میری آنکھ کھلی تو کچھ عجب ماجرا تھا۔ منیجر پرکاش کی حویلی کے گرد و نواح میں دہشت و سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ آپس میں چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا بڑھا تو پولس کو منیجر پرکاش کی لاش الٹ کر دیکھتا ہوا، دیکھا تو میں تکتا ہی رہ گیا۔ جسم پر خون کے دھبے منیجر کی بری موت کا اعلان کر رہے تھے۔ چہرے کا رنگ پہچاننا میرے بس سے باہر کی بات لگی تھی — جب میری نظر اُسی نوجوان پر پڑی جو انسپکٹر کی حراست میں تھا تو مجھے سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔

پولس انسپکٹر اس نوجوان سے منیجر پرکاش کے قتل کی واردات کی تفتیش کر رہا تھا۔ وہ نوجوان پولس کی حراست میں ایک قاتل کی حیثیت سے مجرم بنا جواب دے رہا تھا۔ وہ لوگوں کی بھیڑ پر بار بار نگاہیں اٹھاتا شاید اس کی آنکھیں لوگوں کی بھیڑ اور فضا کے رنگ سے پوچھ رہی تھیں کہ مجرم کون ہے...... مجرم کون ہے...... مجرم کون ہے......؟

✪✪✪

دل کی بات

اے جاتے ہوئے لمحوں ذرا ٹھہرو! شہر کے شور وغل سے دور برف، ریت یا پھر جنگل کے درمیان 'ہنی مون' (Honey Moon) منانے کا ارادہ اُس کے اُن حسین لمحوں کو اور بھی خوشگوار بنا دیتا ہے جو کبھی کبھی اُس کے دل و دماغ میں شادی کے بعد گھومنے کا ارادہ بن کر جنم لیتے تھے۔ چاندنی رات میں اپنی ہونے والی رفیقۂ حیات کے ساتھ گھومنے کا خاکہ بناتا۔ سوچتا تھا ہم دن ڈھلنے کے بعد وہاں ہوں گے جہاں کی شام کافی رومانی ہوگی۔ چاروں طرف قدرتی دل کش مناظر دونوں کی زندگی کے لیے بہترین آغاز — تاروں سے مزین آسمان رات کو خوشنما بنا رہے ہوں گے۔ زندگی کی نئی شروعات کا تصور، آدمی کے ارادوں میں حسین لمحات کا تخیل۔ دل کی بات سننے والا۔ خوشگوار زندگی کی چاہت فطری بات ہے۔

کتنی خوشگوار تھی وہ شام جب اسلم تلک اور جہیز کی مسرت و شادمانیاں دامن گیر کیے شادی کا سرخ جوڑا زیبِ تن کر رہا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر جذبات میں ہلچل مچا دینے

والے شادی کے نغمے الاپ رہا تھا۔ راستے بجلی کے چھوٹے بڑے رنگین قمقموں سے مزین تھے۔ سارا ماحول خوشی کے بحر بیکراں میں غوطہ زن تھا۔ بارات بجی، اسلم گھوڑے پر نوشاہِ وقت بنا باراتیوں کے ہمراہ نازیہ کے دروازہ پر پہنچا۔

شام کی سُرمئی سرخی رات کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگی۔ بارات خوشیوں کا خزانہ لٹاتے نازیہ کے دروازہ پر رک گئی۔ سارے باراتی ناشتہ چائے کے بعد محفل میں اپنی اپنی جگہ سنبھالنے لگے۔ باراتیوں کی چہ می گوئیاں سے ساکت فضا میں زلزلہ پیدا ہورہا تھا۔ نکاح کا وقت آپہنچا۔ باراتی نازیہ کے حُسن و جوانی کے ہمراہ تلک اور جہیز میں لاکھوں سے متجاوز سامانوں کی لمبی قطار کو موضوع بنا کر ماحول کا مزہ لے رہے تھے۔

مجلس میں سے ایک قدآور بزرگ مقطع داڑھی، بارعب چہرہ، پُروقار عالمانہ شخصیت کے مالک مولانا صاحب کھڑے ہوئے۔ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ حاضرین! یہ شادی کا مبارک موقع ہے۔ اس سے پہلے کہ میں خطبہ پڑھوں آیئے! میں آپ کو کچھ قیمتی باتیں بتاؤں۔ مولانا صاحب نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے تقریر شروع کی۔ نوجوانانِ قوم وملت! آپ ذرا حالات حاضرہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر دورِ جدید میں ہورہی شادی کے رسم ورواج کو سامنے لائیں۔ قوم کی فاطماؤں اور سیتاؤں کا تقدّس ہمارے ہاتھوں پامال ہورہا ہے۔ ذرا ٹھہرو اور سوچو! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ دور جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا۔ آج سائنس اور ٹکنالوجی کے زمانہ میں جدید ترین طریقوں کا سہارا لے کر ماضی کی داستان دہرائی جارہی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ نوجوانو! کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کرنے والی عورت ہی تو ہوسکتی ہے۔ ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' — مولانا صاحب کی تقریر میں تیزی آگئی تھی۔ وہ جذباتی ہوگئے تھے۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم نے شادی بیاہ کے مقدّس رشتے کو تجارت میں تبدیل کردیا ہے۔ نوجوانو! تم بازار میں فروخت ہونے والی چیز نہ بنو! شادی کو تجارت

نہ بناؤ!! قوم کی فاطماؤں اور سیتاؤں کو جہیز کے لیے زندہ نہ جلاؤ۔ گھر آنگن کو جنّت کا نمونہ بناؤ۔ زینتِ زیست کو بے رحمی سے قتل نہ کرو۔ قوم کی بیٹیاں فحش کاری کے اڈوں کی زینت نہ بنیں۔ اس کے لیے سماج کے باشعور افراد کو آگے آنا چاہیے۔ کان کھول کر سن لو! زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں سے قیامت کے دن سوال کیا جائے گا تو کیا تلک اور جہیز سے مجبور ہوکر جان گنوانے والی لڑکیوں سے نہیں پوچھا جائے گا؟ یقیناً بازپرس ہوگی۔ جب مالک دو جہاں تم سے سوال کرے گا تو تم کیا جواب دو گے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں دورِ حاضر کے اُن سنگ دل اور بے درد نوجوانوں سے جن کی ناعاقبت اندیشی سے قوم کی معصوم بیٹیاں بن بیاہی تمہیں کوس رہی ہیں—— مولانا صاحب! دیر ہورہی ہے۔ خطبۂ نکاح پڑھا جائے!! درمیان میں سے ایک باراتی نے ٹوکا۔ چپ رہو! خاموش بیٹھو!! میری بات سنو!!! مولانا صاحب نے اُس کو زوردار ڈانٹ پلائی اور پھر گویا ہوئے حاضرین! شادی میں مول جول بند ہونا چاہیے۔ جوانوں کو اشیائے خورد ونوش کی طرح بازار میں بکنے سے بچنا چاہیے۔ لڑکی والوں کے سامنے آپ دستِ گدائی پھیلائیں یہ آپ کی توہین ہے۔ ایک طرف بھیک مانگنا اور دوسری طرف سماج میں ناک اونچی کرنا یہ کون سا طرزِ زندگی ہے۔ جب بیٹا کو لڑکی والے کے ہاتھ سے روپے کے عوض بیچ دیا اور تمہارا بیٹا تمہاری پکڑ سے باہر ہوگیا تو تم ہی بتاؤ اِس میں قصور کس کا ہے؟ نئی نسل کے نوجوانو! آج ہمارا سماج جن مہلک بیماریوں سے دوچار ہے ان میں سے ایک بڑا مرض تلک اور جہیز ہے۔ جس نے ہمارے معاشرے کو بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا صاحب کی تقریر ختم ہوچکی تھی۔ اب بہ حیثیت قاضی انہوں نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ ماحول پر سناٹے کی حکمرانی ہوگئی۔ چند لمحہ بعد اسلم کی زوردار گرج نے سکوت کو منتشر کردیا—— "جب تک شادی کا پورا سامان اور وعدہ کے مطابق پچاس ہزار روپے سامنے نہیں لائے جائیں گے اس وقت تک میں نکاح قبول نہیں کروں گا۔" اسلم کی

ضد نے لوگوں کو چونکا دیا۔ محفل نکاح میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لوگ ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ پر معاملہ اسلم کی ضد پر ساکن تھا۔ سبھوں کی نگاہیں نازیہ کے والد کے چہرہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ نازیہ کے والد کے چہرہ پر تفکر اور ذلّت نے اپنا ڈیرہ جما لیا۔ وہ بوجھل قدموں سے چند احباب کے ساتھ اُٹھے۔ چند منٹ بعد جاوید کو ہمراہ لیے محفل نکاح میں آئے۔ قاضی صاحب کو خطبہ دینے کا اشارہ کیا۔ قاضی صاحب نے خطبہ پڑھا۔ اُس عقل مند، پیرو سنت اور سماج سدھارک لڑکی والے نے جاوید سے بارات کے روبرو اپنی دختر نیک اختر نازیہ کا نکاح پڑھا دیا۔

اب کیا تھا۔ اسلم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ فانوس اور قمقموں کی روشنیاں اژدہا بن کر باراتیوں کو ڈسنے لگیں۔ سارے باراتی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔

اسلم تلک اور جہیز کی حسرت اور نہ ملنے کی اذیت لیے بوجھل قدموں سے آنسو بہاتا، تذلیل وتحقیر کے سائے کو پیچھے لوٹ جانے کو ہاتھ جوڑتا ہوا تاریک رات میں بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگتا اور ہانپتا ہوا اسلم آنگن میں آگرا۔ عوام کے بیچ بے عزّتی اور دل پر لگی چوٹ آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بن کر بہنے لگی۔ اُس کے دل پر زوردار چوٹ لگی تھی۔ اُس کا ضمیر اُسے ملامت کر رہا تھا۔

✪✪✪

بازارِ حسن

بازارِ حسن کی چڑیوں کی مسلسل نغمہ سرائی کی دور سے آنے والی آوازیں اُس کی سماعت سے ٹکراتیں۔ بازار کے تازہ اور باسی پھولوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر چلتا رہتا تھا۔ انور ضلع عدالت میں سرکاری ملازم تھا۔ وہ ایک ماہ سے ادھر کرایہ کے مکان میں رہ رہا تھا۔ دس بجے اپنے کمرے سے ڈیوٹی پر نکلتا اور شام کو دفتر سے فارغ ہو کر لوٹتا۔ آتے جاتے مایہ، گلفام، چنی بیگم، منّی بائی، نغمہ بائی وغیرہ ناموں کی تختیوں پر اس کی نگاہ پڑتی تھی۔ انور سنجیدہ، باوقار، سلیقہ مند، تھا۔ ۲۵، ۲۶ سال کا جوان تھا۔ مہذّب اور خوددار تھا۔ باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُسے ایک ملازم پیشہ دوست نے اس طرف کرایہ پر مکان دلوایا تھا۔ یہاں کا منظر کچھ عجیب تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انسانی تقدّس روزانہ پامال ہو رہا تھا۔ انسانیت کی مقتل گاہ اور حیوانیت کی آماجگاہ تھی یہ نئی جگہ اس کے لیے۔

شب تار ہو یا شب ماہ۔ بازار حسن تھا کہ ہر روز سجتا اور سنورتا ہی تھا۔ شام ہوتے ہی ادھر بھیڑ تھی کہ اُمڈتی ہی چلی آتی تھی۔ درحقیقت عورت ذات کے بارے میں کوئی

رائے قائم کرنا کافی مشکل کام ہے۔ جس لڑکی کو دیکھ کر لگتا کہ اس کی عمر ۱۸، ۲۰ سال کی ہوگی قریب آنے پر پتہ چلتا کہ ۳۵، ۴۰ سال کی ہے۔ بناؤ سنگھار، میک اَپ کے اس دور میں اصلی نقلی کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔

یہاں آتماؤں کا ملاپ نہیں ہوتا بلکہ جسموں کا ملاپ ہوتا اور باہم سائے نمودار ہوتے اور رات کی گہری کھائی میں اتر جاتے۔ اُس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورت بچّہ جننے پر اور اپنی تکمیل پا کر فطری خوشی محسوس کرتی ہے۔ لیکن یہاں یہ تماشہ دیکھ کر کون دعوا سے کہہ سکتا ہے کہ نووارد بچہ کس مرد کا ہے؟ یہ تو عورت ہی صحیح جانتی ہے کہ بچّے کا اصل باپ کون ہے۔

اِدھر سے گزرتے وقت انور کی حسّاس آنکھیں ہر دم سنجیدہ رہا کرتیں۔ وہ پاک دامن اور شریف انسان تھا مگر تھا تو وہ بھی گوشت پوست کا انسان۔ اس کے دل میں بھی ہیجان بپا ہوتا۔ پھر قابو پالیتا۔ اس دور میں آدمی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ سکون پانے کی خاطر دربدر بھٹکتا ہے۔ مگر سکون اُسے نصیب نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتا کہ بازار میں ہر نووارد اپنی پیاس بجھا کر چل دیتا۔ لیکن اس عورت کی روح تک کوئی بھولے بھٹکے بھی نہیں جاتا۔ اس کے درد اور کرب کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ سوچتا کہ آخر اس بازار کی بنیاد کب پڑی؟ کیوں کر پڑی؟ کس نے ڈالی ہوگی اس بازار کی بنیاد؟ آخر وہ بھی تو اسی سماج کا آدمی ہوگا۔ انور ایک مہینہ میں ہی اس طرف سے اوب چکا تھا۔ وہ گھٹن محسوس کرتا۔ لیکن شہر میں نووارد کے لیے کرایہ پر مکان ملنا بھی تو مشکل تھا۔

بازارِ حسن، شہر کا مشہور طوائف خانہ۔ یہاں عورتوں کے آنے کے دروازے کھلے ہوتے ہیں لیکن جانے کے تمام دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ روز اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا یہاں کی رنگینیاں، ہر گھر کے دروازے پر کھڑی ملتی تھیں۔ چہرہ پر میک اَپ کے ساتھ ہونٹوں پر سرخی جمائے عورتیں اور نوخیز لڑکیاں، جو اپنے جسم کو مصنوعی خوشبو میں شرابور کر کر گراہکوں کو بے ہوش کر دینے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ انسانی جسموں

کی خرید و فروخت کے اس بازار میں گراہکوں کو دیکھتے ہی مصنوعی مسکراہٹ ان کے چہروں پر بکھر جاتی ہے۔ ان مصنوعی مسکراہٹوں کے پس پردہ دم توڑتی ہے ان کی بے بسی اور مجبوریاں۔ اس بازار حسن میں پہنچنے والی نووارد عورتوں کو تربیت دی جاتی ہے، مکاری، چال بازی اور قیمت وصولنے کی، یا تو اس ماحول میں وہ خود سیکھ جاتی ہے یا جبراً سکھا دی جاتی ہیں۔ یہاں کوٹھے پر دھندہ کرنے والی ہر ایک عورت کی کہانی الگ داستان بیان کرتی ہے۔ کچھ کو اپنوں نے لاکر کوٹھے پر بیچ دیا ہے تو کچھ وقت کے ہاتھوں مجبور ہوکر چلی آئی ہیں۔ کچھ تو ایسی ہیں جو اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چل کر اس دھندہ میں ملوث ہیں۔ ہر ایک کوٹھے کی ایک الگ مالکہ ہے جس کے ہاتھوں میں تمام عورتوں کی نکیل رہتی ہے۔ یہاں رقص و موسیقی کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ یہاں پہنچنے والی عورت کی عمر، شکل اور رنگ روپ دیکھ کر قیمت لگتی ہے۔ خرید و فروخت میں عورتوں کے دلالوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ جو عورتوں کو کوٹھے تک پہنچاتے ہیں ایک بار جو یہاں خرید لی جاتی ہے وہ پھر واپس نہیں ہوتی۔ حالات پا بہ زنجیر ہو جاتے۔ کوٹھے پر آنے کے بعد عورتوں کے اصل نام بدل دیئے جاتے ہیں۔ خوبصورت جسم و جان والی مگر بے زبان چہرے کچھ الگ ہی داستان بیان کرتے ہیں۔ گراہک اس منڈی میں مختلف علاقوں اور مختلف صوبوں کی عورتیں تلاش کرتے ہیں۔ ۱۵، ۲۰، ۲۵، ۳۰، ۳۵ برس کی عمر کی طوائفیں گراہکوں کو دستیاب ہو جاتی ہیں۔

کیا غربت نے اس دھندہ میں ان عورتوں کو دھکیل دیا ہے؟ کیا پیٹ کی آگ نے اس دھندہ میں لا کھڑا کیا ہے ان عورتوں کو؟ کیا کوئی جنسی پیاس بجھانے کے بعد بھی اِن سے ان کی آپ بیتی سننے اور جاننے کو چاہتا ہے؟ کبھی کوئی دام محبت میں پھنسا کر یہاں پہنچا دی جاتی ہے۔ کبھی شادی کے جال میں پھنسا کر کچھ دھندہ باز کوٹھے پر فروخت کردیتے ہیں۔ وہ رہتے رہتے سب کچھ جان چکا تھا۔ وہ اکتا گیا تھا ایسے حالات سے۔ وہ نجات دلانا چاہتا تھا عورتوں کو گندے دھندے سے۔ اب وہ بھی

آنے جانے لگا تھا کوٹھے پر۔ دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ وہ بھی کسی طوائف سے ملنے جاتا ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے جسم میں گرمی ہے بھی یا نہیں۔ ایک نئی عمر کی لڑکی جس کی عمر ۱۸، ۲۰ سال کی ہوگی اُس پر دو تین دنوں سے اس کی نظر پڑ رہی تھی۔ لڑکی خوبصورت تھی۔ کسی شریف گھرانے کی معلوم ہو رہی تھی۔ لڑکی کے چہرے سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ انور سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو کسی دلاّل نے دھوکہ سے اس کو یہاں پر لایا ہے۔ وہ لڑکی کا حال جاننے کے لیے بے تاب ہوا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ سسرال جا رہی تھی ریلوے پلیٹ فارم پر بھیڑ میں اس کی گاڑی چھوٹ گئی۔ وہ شوہر سے بچھڑ گئی۔ بے یار و مددگار کھڑی تھی۔ دو لوگوں نے لڑکی سے ہمدردانہ گفتگو کی اور وہ جھانسہ میں آ گئی۔ دونوں نے کوٹھے پر لا کر بیچ دیا۔ یہ سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا وہ کیا کرے۔ کیسے اس معصوم لڑکی کو یہاں سے آزاد کرائے۔ لڑکی کا معصوم چہرہ دیکھ کر اس کا دل انسانی ہمدردی سے پگھل اٹھا تھا۔ اس نے کوٹھے کی مالکہ سے اُسے آزاد کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ مالکہ نے ایک نہ سنی۔ گالی دے کر انور کو بے عزّت کر کے کوٹھے سے اتار دیا۔ کہاں سے چلا آیا ہجڑہ کہیں کا...... دیکھنے میں مرد لگتا ہے لیکن پتہ نہیں......

وہ اِن حالات سے بدظن تھا جہاں زندگی کی بقا محض جسم فروشی کے دھندہ تک محدود ہے۔ اس نے قسم کھالی کہ وہ لڑکی کو آزاد کرا کے دم لے گا۔ وہ بازار حسن کو اجاڑ کر دم لے گا۔ دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ وہ بھی کسی سے ملنے جایا کرتا ہے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ ایک رات اس نے کمر میں خنجر چھپایا اور کوٹھے پر پہنچ گیا۔ بوڑھی مالکہ کے سینے میں خنجر مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لڑکی کو اندھیرے میں چھپا کر بھاگ نکلا۔ ہنگامہ مچا۔ ایک لاش تھی جو طوائفوں کے درمیان سرد پڑی تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ لڑکی کو آزاد کرانے کے بعد اس نے اپنے دوست کے ہمراہ لڑکی کے سسرال بھجوا دیا۔ جب

اس کا دوست لوٹ کر آیا لڑکی کے گھر پہنچ جانے پر اس کو اطمینان ہوگیا تو اس نے راحت کی سانس لی۔ کس نے مارا ہے۔ کون ہے قاتل۔ مجرم کا اب تک سراغ نہیں۔ ہوگا کوئی کوٹھے کا دشمن۔ چرچا تھا کہ قاتل آج نہ کل گرفتار ہوگا۔ کوٹھے سے کچھ کاغذات برآمد ہوئے جس کی درجنوں فوٹو کاپیاں تھیں۔ سماج کے نام کھلا خط تھا۔ لوگو!

طوائف خانوں، بازار حسن کی چمک دمک میں بجی سنوری ان لڑکیوں کی اداس زندگی کے درد اور کرب کو کیا آپ نے کبھی محسوس کیا ہے؟ جن لوگوں نے صرف اِسے تفریح گاہ اور آسودگی جنس کا سودا سمجھ لیا ہے انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ یہ بھی تو اسی مٹی اور اسی دھرتی کی بیٹیاں ہیں۔ انہیں بھی انسانی ہمدردی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہمیں اور آپ کو۔ ذرا سوچئے! اپنا وجود شمع کی مانند پگھلا کر رات بھر دوسروں کو آسودگی بخشنے والی یہ لڑکیاں ہیں تو اسی دھرتی کی۔ کون سوچے گا اس کے روشن مستقبل کو! کون اٹھے گا ان کی آواز بن کر!! یہ بھی کسی دوسری دنیا سے آئے گا؟

ذرا سوچئے! پندرہ بیس برس بعد ان طوائفوں کی بچیاں جب بڑی ہوں گی تو کیا کریں گی؟ جب ان کے بچے بڑے ہوں گے تو کیسا سماج تعمیر کریں گے؟ یقیناً وہ لڑکے جرائم کی تاریک گلیوں ہی میں اتریں گے۔

غیر قانونی طور پر بسی ہوئی ان جگہوں پر ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جس سے آنے والے دنوں میں سماج کو اور سماجی تانے بانے کو خطرہ پہنچنے والا ہے۔ آنکھوں کے سامنے ہر روز رونما ہونے والے عریاں اور فحش کارنامے نوعمر نسل کی معصومیت کو چھین کر اندھیری راہ میں ڈال رہے ہیں۔ یہ خنجر میں نے کوٹھے کی مالکہ کے سینہ میں پیوست کر کے سماج کے سینے میں گہرائی تک اتار دیا ہے۔

انور

اور اب پولس کسی انور نامی شخص کی تلاش میں تھی!

✪✪✪

Aadmi Ki Basti Mein

(A Collection of Stories)

by: Ozair Anjum

عزیر انجم میرے بے حد عزیز دوست ہیں۔ ان کے اندر ایک طرح کی تخلیقی آنچ ہے جو ہر لمحہ سلگتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات کو لفظوں کے پیکر میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے تجریدی طرزِ اظہار کے بجائے سیدھے سچے اسلوب میں زندگی اور معاشرے کی کڑوی کسیلی صداقتوں کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو یہ کہانیاں ہلکی اور حد درجہ کھلی ہوئی معلوم ہوں گی۔ میں ان سے گزارش کروں گا کہ سچائیوں کو برہنگی کے ساتھ بھی دیکھنے کی تاب پیدا کریں اور ساتھ ہی اپنے دوست عزیز انجم سے بھی کہوں گا کہ اس برہنگی پر ذرا ابہام، علامتوں اور استعاروں کا ہلکا سا پردہ بھی ڈالنے کی طرف سوچیں۔ سنا ہے کہ پوشیدگی (Concealment) سے فن پارے میں ادبیت اور چاشنی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اخیر میں ان کی اس پہلی ادبی کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

• **کوثر مظہری**

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

عزیر انجم ایک تازہ مشق کہانی کار ہیں۔ ان کے یہاں رومانیت کی دھوپ چھاؤں، دیہی زندگی کی الجھنیں، عصری مسائل اور فکری معاملات میں کسی نہ کسی نہج پر تازگی نظر آتی ہے۔ گویا وہ ایک طرف عصری حسیت سے واقف ہیں تو دوسری طرف جمالیات کے رمز آشنا بھی ہیں۔ ان کی کہانیوں سے زندگی اور سماج کی جو حقیقتیں آشکارا ہوتی ہیں وہ ہمیں حیرانی میں ڈال دیتی ہیں۔ 'آدمی کی بستی میں'، 'انجام خدا جانے'، 'احساس کی لکیروں سے'، 'لاش' ان کی ایسی ہی کہانیاں ہیں جن میں انھوں نے خوب رنگ آمیزی کی ہے۔ ان کے اظہار میں خلوص و وفا کا عنصر ضرور غالب ہے، لیکن زبان و بیان میں کھردرا پن بھی ہے اور کچھ ناہمواریاں بھی۔ کہیں کہیں کہانی کے بنیادی تقاضوں سے ناآشنائی کھٹکتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی کہانیوں سے ان کی ذہانت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

'آدمی کی بستی میں' عزیر انجم کی کہانیوں کا اولین مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے گہرے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ کہانی آر ادھنا چاہتی ہے اور یہ خصوصیت انھوں نے اپنے اندر پیدا کر لی ہے۔ وہ ایک سچے سماجی کارکن بھی ہیں اس لیے ان سے بہتر سماجی کہانیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس پہلی کاوش کی اشاعت پر میں انھیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

• **مشتاق صدف**

ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com